تفہیم القرآن

الاعراف

(۷)

الاعراف

نام اس سورہ کا نام اَعراف اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کی آیات ۴۶-۴۷ میں اَعراف اور اصحابِ اَعراف کا ذکر آیا ہے۔ گویا اسے ''سورۂ اعراف'' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ''سورہ جس میں اعراف کا ذکر ہے۔''

زمانۂ نزول اِس کے مضامین پر غور کرنے سے بیّن طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ نزول تقریباً وہی ہے جو سورۂ اَنعام کا ہے۔ یہ بات تو یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ یہ پہلے نازل ہوئی ہے یا وہ۔ مگر اندازِ تقریر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ہے یہ اُسی دَور سے متعلق۔ لہٰذا اس کے تاریخی پَسِ منظر کو سمجھنے کے لیے اس دیباچے پر ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا جو ہم نے سورۂ اَنعام پر لکھا ہے۔

مَباحِث اس سورہ کی تقریر کا مرکزی مضمون دعوتِ رسالت ہے۔ ساری گفتگو کا مدّعا یہ ہے کہ مخاطبوں کو خدا کے فرستادہ پیغمبر کی پیروی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن اس دعوت میں انذار (تنبیہ اور ڈراوے) کا رنگ زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے، کیونکہ جو لوگ مخاطَب ہیں (یعنی اہلِ مکہ) انھیں سمجھاتے سمجھاتے ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے اور اُن کی گراں گوشی، ہٹ دھرمی اور مخالفانہ ضد اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ عنقریب پیغمبر کو اُن سے مخاطبہ بند کر کے دوسروں کی طرف رُجوع کرنے کا حکم ملنے والا ہے۔ اس لیے تفہیمی انداز میں قُبولِ رسالت کی دعوت دینے کے ساتھ ان کو یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ جو رَوِش تم نے اپنے پیغمبر کے مقابلے میں اختیار کر رکھی ہے ایسی ہی رَوِش تم سے پہلے کی قومیں اپنے پیغمبروں کے مقابلے میں اختیار کر کے بہت بُرا انجام دیکھ چکی ہیں۔ پھر چونکہ ان پر حُجت تمام ہونے کے قریب آ گئی ہے، اس لیے تقریر کے آخری حصّے میں دعوت کا رُخ اُن سے ہٹ کر اہلِ کتاب کی طرف پھر گیا ہے اور ایک جگہ تمام دنیا کے لوگوں سے عام خطاب بھی کیا گیا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ اب ہجرت قریب ہے اور وہ دَور جس میں نبی کا خطاب تمام تر اپنے قریب کے لوگوں سے ہُوا کرتا ہے، خاتمے پر آ لگا ہے۔

دورانِ تقریر میں چونکہ خطاب کا رُخ یہود کی طرف بھی پھر گیا ہے، اس لیے ساتھ ساتھ دعوتِ رسالت کے اِس پہلو کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اُس کے ساتھ منافقانہ رَوِش اختیار کرنے، اور سمع و طاعت کا عہد اُستوار کرنے کے بعد اسے توڑ دینے، اور حق و باطل کی تمیز سے واقف ہو جانے کے بعد باطل پرستی میں مُستغرق رہنے کا انجام کیا ہے۔

سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کو حکمتِ تبلیغ کے متعلق چند اہم ہدایات دی گئی ہیں اور خصوصیّت کے ساتھ انھیں نصیحت کی گئی ہے کہ مخالفین کی اشتعال انگیزیوں اور چیرہ دستیوں کے مقابلے میں صبر و ضبط سے کام لیں اور جذبات کے ہیجان میں مبتلا ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو اصل مقصد کو نقصان پہنچانے والا ہو۔

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

ا، ل، م، ص۔ یہ ایک کتاب ہے جو تمھاری طرف نازل کی گئی ہے[۱]، پس اے محمدؐ! تمھارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو۔[۲] اس کے اُتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے سے (منکرین کو) ڈراؤ اور ایمان لانے والے لوگوں کو یاددہانی ہو۔[۳]

۱۔ کتاب سے مراد یہی سورہ اعراف ہے۔

۲۔ یعنی بغیر کسی جھجک اور خوف کے اِسے لوگوں تک پہنچا دو اور اس بات کی کچھ پروا نہ کرو کہ مخالفین اس کا کیسا استقبال کریں گے۔ وہ بگڑتے ہیں، بگڑیں۔ مذاق اُڑاتے ہیں، اُڑائیں۔ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، بنائیں۔ دشمنی میں اور زیادہ سخت ہوتے ہیں، ہو جائیں۔ تم بے کھٹکے اس پیغام کو پہنچاؤ اور اس کی تبلیغ میں ذرا باک نہ کرو۔

جس مفہوم کے لیے ہم نے لفظ جھجک استعمال کیا ہے، اصل عبارت میں اس کے لیے لفظ حَرَجٌ استعمال ہوا ہے۔ لُغت میں حَرَج اُس گھنی جھاڑی کو کہتے ہیں جس میں سے گزرنا مشکل ہو۔ دل میں حرج ہونے کا مطلب یہ ہُوا کہ مخالفتوں اور مزاحمتوں کے درمیان اپنا راستہ صاف نہ پاکر آدمی کا دل آگے بڑھنے سے رُکے۔ اسی مضمون کو قرآنِ مجید میں مُتعدِّد مقامات پر ضِیقِ صدر کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ مثلاً وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ (الحِجر، آیت ۹۷) "اے محمدؐ! ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تم دل تنگ ہوتے ہو۔" یعنی تمھیں پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی اور مخالفتِ حق کا یہ حال ہے، انھیں آخر کس طرح سیدھی راہ پر لایا جائے۔ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ (ھُود، آیت ۱۲) "تو کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تم پر وحی کیا جا رہا ہے اس میں سے کوئی چیز تم بیان کرنے سے چھوڑ دو اور اس بات سے دل تنگ ہو کہ وہ تمھاری دعوت کے جواب میں کہیں گے: اِس پر کوئی خزانہ کیوں نہ اُترا، یا اِس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا۔"

۳۔ مطلب یہ ہے کہ اس سورہ کا اصل مقصد تو ہے اِنذار، یعنی لوگوں کو رسول کی دعوت قبول نہ کرنے کے نتائج سے ڈرانا اور غافلوں کو چونکانا اور مُتنبِّہ کرنا، رہی اہلِ ایمان کی تذکیر (یاددہانی) تو وہ ایک ضمنی فائدہ ہے جو اِنذار کے سلسلے میں خود بخود

اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ‌ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۳﴾ وَكَمۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا فَجَآءَهَا بَاۡسُنَا بَيَاتًا اَوۡ هُمۡ قَآئِلُوۡنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعۡوٰٮهُمۡ اِذۡ جَآءَهُمۡ بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۵﴾

لوگو! جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اُس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو[۴] ـــــ مگر تم نصیحت کم ہی مانتے ہو۔ کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ اُن پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا، یا دن دہاڑے ایسے وقت آیا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔ اور جب ہمارا عذاب اُن پر آ گیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔[۵]

حاصل ہو جاتا ہے۔

۴ — یہ اِس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ اصل دعوت جو اس خطبے میں دی گئی ہے، وہ یہی ہے کہ انسان کو دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لیے جو علم اُسے درکار ہے، اور اپنے اَخلاق، تہذیب، معاشرت اور تمدُّن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اُصولوں کا وہ محتاج ہے، ان سب کے لیے اُسے صرف اللہ رب العالمین کو اپنا رہنما تسلیم کرنا چاہیے اور صرف اُسی ہدایت کی پیروی اختیار کرنی چاہیے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے بھیجی ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے لیے رُجوع کرنا اور اپنے آپ کو اُس کی رہنمائی کے حوالے کر دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر ایک غلط طریقِ کار ہے، جس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلا ہے اور ہمیشہ تباہی کی صورت ہی میں نکلے گا۔

یہاں ’’اَوۡلِيَآءَ‘‘ (سرپرستوں) کا لفظ اس معنٰی میں استعمال ہُوا ہے کہ انسان جس کی رہنمائی پر چلتا ہے، اُسے درحقیقت اپنا ولی و سرپرست بناتا ہے، خواہ زبان سے اس کی حمد و ثنا کے گیت گاتا ہو یا اس پر لعنت کی بوچھاڑ کرتا ہو، خواہ اس کی سرپرستی کا معترف ہو یا بشدّت اس سے انکار کرے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الشُّوریٰ، حاشیہ ۶)

۵ — یعنی تمھاری عبرت کے لیے اُن قوموں کی مثالیں موجود ہیں جو خدا کی ہدایت سے منحرف ہو کر انسانوں اور شیطانوں کی رہنمائی پر چلیں اور آخرِ کار اس قدر بگڑیں کہ زمین پر ان کا وجود ایک ناقابلِ برداشت لعنت بن گیا اور خدا کے عذاب نے آ کر اُن کی

فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِيۡنَ اُرۡسِلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِيۡنَۙ ۝۶

پس یہ ضرور ہوکر رہنا ہے کہ ہم اُن لوگوں سے باز پُرس کریں[6] جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں، اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں (کہ اُنھوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انھیں اس کا کیا جواب ملا)[7]۔

نجاست سے دُنیا کو پاک کر دیا۔

آخری فقرے سے مقصود دو باتوں پر مُتنبِّہ کرنا ہے: ایک یہ کہ تلافی کا وقت گزر جانے کے بعد کسی کا ہوش میں آنا اور اپنی غَلَطیوں کا اعتراف کرنا بے کار ہے۔ سخت نادان ہے وہ شخص اور وہ قوم جو خدا کی دی ہوئی مہلت کو غفلتوں اور سرشاریوں میں ضائع کر دے اور داعیانِ حق کی صداؤں کو بہرے کانوں سے سُنے جائے اور ہوش میں صرف اس وقت آئے جب اللہ کی گرفت کا مضبوط ہاتھ اس پر پڑ چکا ہو۔ دوسرے یہ کہ افراد کی زندگیوں میں بھی اور اقوام کی زندگیوں میں بھی ایک دو نہیں، بے شمار مثالیں تمھارے سامنے گزر چکی ہیں کہ جب کسی کی غلط کاریوں کا پیمانہ لبریز ہو چکتا ہے اور وہ اپنی مہلت کی حد کو پہنچ جاتا ہے تو پھر خدا کی گرفت اچانک اسے آ پکڑتی ہے، اور ایک مرتبہ پکڑ میں آ جانے کے بعد چھٹکارے کی کوئی سبیل اُسے نہیں ملتی۔ پھر جب تاریخ کے دوران میں ایک دو دفعہ نہیں، سیکڑوں اور ہزاروں مرتبہ یہی کچھ ہو چکا ہے تو آخر کیا ضرور ہے کہ انسان اسی غَلَطی کا بار بار اعادہ کیے چلا جائے، اور ہوش میں آنے کے لیے اُسی آخری ساعت کا انتظار کرتا رہے جب ہوش میں آنے کا کوئی فائدہ حسرت واندوہ کے سوا نہیں ہوتا۔

۶ – باز پُرس سے مراد روزِ قیامت کی باز پُرس ہے۔ بدکار افراد اور قوموں پر دُنیا میں جو عذاب آتا ہے، وہ دراصل ان کے اعمال کی باز پُرس نہیں ہے اور نہ وہ ان کے جرائم کی پوری سزا ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت تو بالکل ایسی ہے جیسے کوئی مجرم جو چھوٹا پھر رہا تھا، اچانک گرفتار کر لیا جائے اور مزید ظلم و فساد کے مواقع اس سے چھین لیے جائیں۔ تاریخِ انسانی اس قسم کی گرفتاریوں کی بے شمار نظیروں سے بھری پڑی ہے، اور یہ نظیریں اس بات کی ایک صریح علامت ہیں کہ انسان کو دنیا میں شُترِ بے مہار کی طرح چھوڑ نہیں دیا گیا ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے، بلکہ اُوپر کوئی طاقت ہے جو ایک حدِ خاص تک اسے ڈھیل دیتی ہے، تنبیہات پر تنبیہات بھیجتی ہے کہ اپنی شرارتوں سے باز آ جائے، اور جب وہ کسی طرح باز نہیں آتا تو اسے اچانک پکڑ لیتی ہے۔ پھر اگر کوئی اس تاریخی تجرِبے پر غور کرے تو بآسانی یہ نتیجہ بھی نکال سکتا ہے کہ جو فرماں روا اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے، اس نے ضرور ایسا ایک وقت مقرر کیا ہوگا جب اِن سارے مجرموں پر عدالت قائم ہوگی اور ان سے ان کے اعمال کی باز پُرس کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اُوپر کی آیت کو، جس میں دنیوی عذاب کا ذکر کیا گیا ہے، بعد والی آیت کے ساتھ لفظ ''پس'' کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، گویا اس دنیوی عذاب کا بار بار واقع ہونا آخرت کی باز پرس کے یقیناً واقع ہونے پر ایک دلیل ہے۔

۷ – اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کی باز پُرس سراسر رسالت ہی کی بنیاد پر ہوگی۔ ایک طرف پیغمبروںؑ سے پوچھا جائے گا کہ تم نے نوعِ انسانی تک خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے کیا کچھ کیا۔ دوسری طرف جن لوگوں تک رسولوں کا پیغام پہنچا، ان سے سوال کیا جائے گا کہ اس پیغام کے ساتھ تم نے کیا برتاؤ کیا۔ جس شخص یا جن انسانی گروہوں تک انبیاؑ کا پیغام نہ پہنچا ہو، ان کے

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ﴿٧﴾ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٨﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا

پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے آگے پیش کر دیں گے، آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔ اور وزن اُس روز عین حق[8] ہوگا۔ جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے رہیں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں[9] گے، کیونکہ وہ ہماری

بارے میں تو قرآن ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ ان کے مُقدّمے کا کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا ہے۔ لیکن جن اشخاص و اقوام تک پیغمبروںؑ کی تعلیم پہنچ چکی ہے، ان کے متعلق قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ اپنے کفر و انکار اور فسق و نافرمانی کے لیے کوئی حُجّت نہ پیش کر سکیں گے، اور ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ حسرت و ندامت کے ساتھ ہاتھ ملتے ہوئے جہنّم کی راہ لیں۔

۸ - اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس روز خدا کی میزانِ عدل میں وزن اور حق دونوں ایک دوسرے کے ہم معنیٰ ہوں گے۔ حق کے سوا کوئی چیز وہاں وزنی نہ ہوگی، اور وزن کے سوا کوئی چیز حق نہ ہوگی۔ جس کے ساتھ جتنا حق ہوگا، اتنا ہی وہ باوزن ہوگا۔ اور فیصلہ جو کچھ بھی ہوگا وزن کے لحاظ سے ہوگا، کسی دوسری چیز کا ذرّہ برابر لحاظ نہ کیا جائے گا۔ باطل کی پوری زندگی، خواہ دنیا میں کتنی ہی طویل و عریض رہی ہو اور کتنے ہی بظاہر شان دار کارنامے اس کی پشت پر ہوں، اس ترازو میں سراسر بے وزن قرار پائے گی۔ باطل پرست جب اُس میزان میں تولے جائیں گے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ دُنیا میں جو کچھ وہ مدّت العمر کرتے رہے وہ سب ایک پرِکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا۔ یہی بات ہے جو سورۂ کہف، آیات ۱۰۳ تا ۱۰۵ میں فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ دُنیا کی زندگی میں سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتے رہے اور اللہ کی آیات سے انکار کر کے جن لوگوں نے یہ سمجھتے ہوئے کام کیا کہ انجامِ کار کوئی آخرت نہیں ہے اور کسی کو حساب دینا نہیں ہے، ان کے کارنامۂ زندگی کو ہم آخرت میں کوئی وزن نہ دیں گے۔

۹ - اس مضمون کو یوں سمجھیے کہ انسان کا کارنامۂ زندگی دو پہلوؤں میں تقسیم ہوگا: ایک مثبت پہلو اور دوسرا منفی پہلو۔ مثبت پہلو میں صرف حق کو جاننا اور ماننا اور حق کی پیروی میں حق ہی کی خاطر کام کرنا شمار ہوگا، اور آخرت میں اگر کوئی چیز وزنی اور قیمتی ہوگی تو وہ بس یہی ہوگی۔ بخلاف اس کے، حق سے غافل ہو کر یا حق سے منحرف ہو کر انسان جو کچھ بھی اپنی خواہشِ نفس یا دوسرے انسانوں اور شیطانوں کی پیروی کرتے ہوئے غیرِ حق کی راہ میں کرتا ہے، وہ سب منفی پہلو میں جگہ پائے گا، اور صرف یہی نہیں کہ یہ منفی پہلو بجائے خود بے قدر رہو گا، بلکہ یہ آدمی کے مثبت پہلوؤں کی قدر بھی گھٹا دے گا۔

پس آخرت میں انسان کی فلاح و کامرانی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس کے کارنامۂ زندگی کا مثبت پہلو اس کے
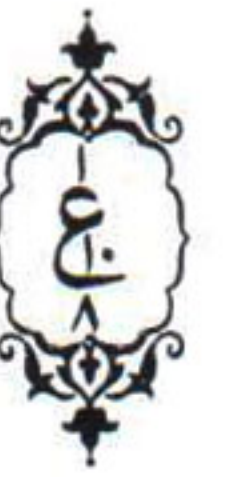
آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے۔

ہم نے تمھیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمھارے لیے یہاں سامانِ زیست فراہم کیا، مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔ع

ہم نے تمھاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمھاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو۔[10]

منفی پہلو پر غالب ہو اور نقصانات میں بہت کچھ دے دلا کر بھی اس کے حساب میں کچھ نہ کچھ بچا رہ جائے۔ رہا وہ شخص جس کی زندگی کا منفی پہلو اُس کے تمام مثبت پہلوؤں کو دبا لے، تو اُس کا حال بالکل اُس دیوالیہ تاجر کا سا ہو گا جس کی ساری پونجی خساروں کا بھگتان بھگتنے اور مطالبات ادا کرنے ہی میں کھپ جائے اور پھر بھی کچھ نہ کچھ مطالبات اس کے ذمّے باقی رہ جائیں۔

۱۰- تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بَقرہ، آیات ۳۰ تا ۳۹۔

سورۂ بَقرہ میں حکمِ سجدہ کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے ان سے شبہ ہو سکتا تھا کہ فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم صرف آدم علیہ السلام کی شخصیت کے لیے دیا گیا تھا۔ مگر یہاں وہ شبہ دُور ہو جاتا ہے۔ یہاں جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کرایا گیا تھا، وہ آدم ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ نوعِ انسانی کا نمایندہ فرد ہونے کی حیثیت سے تھا۔

اور یہ جو فرمایا کہ ”ہم نے تمھاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمھیں صورت بخشی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو“، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمھاری تخلیق کا منصوبہ بنایا اور تمھارا مادّۂ آفرینش تیار کیا، پھر اس مادّے کو انسانی صورت عطا کی، پھر جب ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے انسان وجود میں آ گیا تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ اس آیت کی یہ تشریح خود قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ مثلاً سورۂ صٓ میں ہے: اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ (آیات: ۷۱-۷۲) ”تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمھارے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں، تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔“ اِس آیت میں وہی تین مراتب ایک دوسرے انداز میں بیان کیے گئے ہیں، یعنی پہلے مٹی سے ایک بشر کی تخلیق، پھر اس کا تسویہ، یعنی اس کی شکل وصورت بنانا اور اس کے اعضا اور اس کی قوتوں کا تناسُب قائم کرنا، پھر اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک کر آدم کو وجود میں لے آنا۔ اسی مضمون کو سورۂ حِجر میں

بایں الفاظ ادا کیا گیا ہے: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ○ (آیات: ۲۸-۲۹) ’’اور تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمھارے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ میں خمیر اُٹھی ہوئی مٹی کے گارے سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کرلوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں، تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔‘‘

تخلیقِ انسانی کے اِس آغاز کو اس کی تفصیلی کیفیّت کے ساتھ سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ہم اس حقیقت کا پوری طرح اِدراک نہیں کرسکتے کہ موادِ ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا، پھر اس کی صورت گری اور تعدیل کیسے ہوئی، اور اس کے اندر روح پھونکنے کی نوعیّت کیا تھی۔ لیکن بہرحال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید انسانیت کے آغاز کی کیفیّت اُن نظریّات کے خلاف بیان کرتا ہے جو موجودہ زمانے میں ڈارون کے متبعین سائنس کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ان نظریّات کی رُو سے انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبۂ انسانیت تک پہنچا ہے، اور اس تدریجی ارتقا کے طویل خط میں کوئی نقطۂ خاص ایسا نہیں ہوسکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کو ختم قرار دے کر ’’نوعِ انسانی‘‘ کا آغاز تسلیم کیا جائے۔ بخلاف اس کے، قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت ہی سے ہوا ہے، اُس کی تاریخ کسی غیر انسانی حالت سے قطعاً کوئی رشتہ نہیں رکھتی، وہ اوّل روز سے انسان ہی بنایا گیا تھا اور خدا نے کامل انسانی شُعور کے ساتھ پوری روشنی میں اس کی ارضی زندگی کی ابتدا کی تھی۔

انسانیت کی تاریخ کے متعلق یہ دو مختلف نقطۂ نظر ہیں اور ان سے انسانیت کے دو بالکل مختلف تصوّر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تصور کو اختیار کیجیے تو آپ کو انسان اصلِ حیوانی کی ایک فرع نظر آئے گا۔ اس کی زندگی کے جملہ قوانین، حتّٰی کہ اَخلاقی قوانین کے لیے بھی آپ بنیادی اُصول اُن قوانین میں تلاش کریں گے جن کے تحت حیوانی زندگی چل رہی ہے۔ اُس کے لیے حیوانات کا سا طرزِ عمل آپ کو بالکل ایک فطری طرزِ عمل معلوم ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جو فرق انسانی طرزِ عمل اور حیوانی طرزِ عمل میں آپ دیکھنا چاہیں گے، وہ بس اتنا ہی ہوگا کہ حیوانات جو کچھ آلات اور صنائع اور تمدّنی آرایشوں اور تہذیبی نقش و نگار کے بغیر کرتے ہیں، انسان وہی سب کچھ ان چیزوں کے ساتھ کرلے۔ اس کے برعکس دوسرا تصوّر اختیار کرتے ہی آپ انسان کو جانور کے بجائے ’’انسان‘‘ ہونے کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ آپ کی نگاہ میں وہ ’’حیوان ناطق‘‘ یا ’’متمدن جانور‘‘ نہیں ہوگا بلکہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہوگا۔ آپ کے نزدیک وہ چیز جو اُسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے، اس کا نُطق یا اس کی اجتماعیت نہ ہوگی، بلکہ اس کی اَخلاقی ذمّہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہوگی جسے خدا نے اس کے سُپرد کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس طرح انسانیت اور اس کے جملہ متعلقات پر آپ کی نظر پہلے زاویۂ نظر سے یک سر مختلف ہوجائے گی۔ آپ انسان کے لیے ایک دوسرا ہی فلسفۂ حیات اور ایک دوسرا ہی نظامِ اَخلاق و تمدّن و قانون طلب کرنے لگیں گے، اور اس فلسفے اور اس نظام کے اُصول و مبادی تلاش کرنے کے لیے آپ کی نگاہ خود بخود عالمِ اَسفل کے بجائے عالمِ بالا کی طرف اُٹھنے لگے گی۔

اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ یہ دوسرا تصورِ انسان چاہے اخلاقی اور نفسیاتی حیثیت سے کتنا ہی بلند ہو مگر محض اس تخیل

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾

اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہُوا۔

پوچھا: ”تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ مَیں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟“

بولا: ”میں اُس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسے مٹی سے۔“

فرمایا: ”اچھا، تو یہاں سے نیچے اُتر۔ تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ درحقیقت تو اُن لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلّت چاہتے ہیں۔[11]“

کی خاطر ایک ایسے نظریّے کو کس طرح رد کر دیا جائے جو سائنٹفک دلائل سے ثابت ہے۔ لیکن جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع ڈارونی نظریّۂ ارتقا سائنٹفک دلائل سے ثابت ہو چکا ہے؟ سائنس سے محض سرسری واقفیت رکھنے والے لوگ تو بے شک اس غلط فہمی میں ہیں کہ یہ نظریّہ ایک ثابت شدہ علمی حقیقت بن چکا ہے، لیکن محققین اس بات کو جانتے ہیں کہ الفاظ اور ہڈیوں کے لمبے چوڑے سروسامان کے باوجود ابھی تک یہ صرف ایک نظریّہ ہی ہے اور اس کے جن دلائل کو غلطی سے دلائلِ ثبوت کہا جاتا ہے وہ دراصل محض دلائلِ اِمکان ہیں، یعنی ان کی بنا پر زیادہ سے زیادہ بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ڈارونی ارتقا کا ویسا ہی امکان ہے جیسا براہِ راست عملِ تخلیق سے ایک ایک نوع کے الگ الگ وجود میں آنے کا امکان ہے۔

۱۱ – اصل میں لفظ صاغرین استعمال ہوا ہے۔ صاغر کے معنٰی ہیں: الراضی بالذُّل، یعنی وہ جو ذلّت اور صغار اور چھوٹی حیثیت کو خود اختیار کرے۔ پس اللہ تعالٰی کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ بندہ اور مخلوق ہونے کے باوجود تیرا اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا ہونا اور اپنے رب کے حکم سے اس بنا پر سرتابی کرنا کہ اپنی عزت و برتری کا جو تصوّر تو نے خود قائم کر لیا ہے اس کے لحاظ سے وہ حکم تجھے اپنے لیے موجبِ توہین نظر آتا ہے، یہ دراصل یہ معنٰی رکھتا ہے کہ تُو خود اپنی ذلّت چاہتا ہے۔ بڑائی کا جھوٹا پندار، عزت کا بے بنیاد ادّعا، اور کسی ذاتی استحقاق کے بغیر اپنے آپ کو خواہ مخواہ بزرگی کے منصب پر فائز سمجھ بیٹھنا تجھے بڑا اور ذی عزّت اور بزرگ نہیں بنا سکتا، بلکہ یہ تجھے چھوٹا اور ذلیل اور پست ہی بنائے گا، اور اپنی اس ذلّت

قَالَ اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ ﴿۱۷﴾

بولا: ''مجھے اُس دن تک مُہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔''

فرمایا: ''تجھے مُہلت ہے۔''

بولا: ''اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے، میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا، اور تُو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔[۱۲]''

وخواری کا سبب تُو آپ ہی ہوگا۔

۱۲- یہ وہ چیلنج تھا جو ابلیس نے خدا کو دیا۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ مُہلت جو آپ نے مجھے قیامت تک کے لیے دی ہے، اِس سے فائدہ اُٹھا کر میں یہ ثابت کرنے کے لیے پورا زور صَرف کر دوں گا کہ انسان اُس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو آپ نے میرے مقابلے میں اسے عطا کی ہے۔ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ یہ کیسا ناشکرا، کیسا نمک حرام اور کیسا احسان فراموش ہے۔

یہ مُہلت جو شیطان نے مانگی اور خدا نے اسے عطا فرما دی، اس سے مراد محض وقت ہی نہیں ہے بلکہ اُس کام کا موقع دینا بھی ہے جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ یعنی اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے انسان کو بہکانے اور اس کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اس کی نااہلی ثابت کرنے کا موقع دیا جائے، اور یہ موقع اللہ تعالیٰ نے اسے دے دیا۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل آیات ۶۱-۶۵ میں اس کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اختیار دے دیا کہ آدمؑ اور اس کی اولاد کو راہِ راست سے ہٹا دینے کے لیے جو چالیں وہ چلنا چاہتا ہے، چلے۔ ان چال بازیوں سے اسے روکا نہیں جائے گا، بلکہ وہ سب راہیں کُھلی رہیں گی جن سے وہ انسان کو فتنے میں ڈالنا چاہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگا دی کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ، یعنی میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار نہ ہوگا۔ تُو صرف اس بات کا مجاز ہوگا کہ ان کو غلط فہمیوں میں ڈالے، جھوٹی اُمیدیں دلائے، بدی اور گمراہی کو ان کے سامنے خوش نُما بنا کر پیش کرے، لذتوں اور فائدوں کے سبز باغ دکھا کر ان کو غلط راستوں کی طرف دعوت دے۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ

فرمایا: "نکل جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہُوا۔ یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے، تجھ سمیت ان سب سے جہنّم کو بھر دوں گا۔ اور اے آدمؑ! تو اور تیری بیوی، دونوں اس جنّت میں رہو، جہاں جس چیز کو تمھارا جی چاہے کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔"

پھر شیطان نے اُن کو بہکایا تاکہ ان کی شرم گاہیں جو ایک دوسرے سے چھُپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے۔ اس نے ان سے کہا: "تمھارے رب نے تمھیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی

مگر یہ طاقت تجھے نہیں دی جائے گی کہ انھیں ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے راستے پر کھینچ لے جائے اور اگر وہ خود راہِ راست پر چلنا چاہیں تو انھیں نہ چلنے دے۔ یہی بات سورۂ ابراہیم، آیت ۲۲ میں فرمائی گئی ہے کہ قیامت میں عدالتِ الٰہی سے فیصلہ صادر ہو جانے کے بعد شیطان اپنے پیروانسانوں سے کہے گا: وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ، یعنی میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں کہ میں نے اپنی پیروی پر تمھیں مجبور کیا ہو، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ تمھیں اپنی راہ پر بُلایا اور تم نے میری دعوت قبول کر لی۔ لہٰذا اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔

اور یہ جو شیطان نے خدا پر الزام عائد کیا ہے کہ تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اپنی معصیت کی ذمہ داری خدا پر ڈالتا ہے۔ اُس کو شکایت ہے کہ آدم کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے کر تو نے مجھے فتنے میں ڈالا اور میرے نفس کے تکبر کو ٹھیس لگا کر مجھے اس حالت میں مبتلا کر دیا کہ میں نے تیری نافرمانی کی۔ گویا اس احمق کی خواہش یہ تھی کہ اس کے نفس کی چوری پکڑی نہ جاتی، بلکہ جس پندارِ غلط اور جس سرکشی کو اس نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دیا جاتا۔ یہ ایک کھُلی ہوئی سفیہانہ بات تھی جس کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سرے سے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔

اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَا مَلَكَيۡنِ اَوۡ تَكُوۡنَا مِنَ الۡخٰلِدِيۡنَ ﴿۲۰﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىۡ لَـكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيۡنَۙ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰٮهُمَا بِغُرُوۡرٍ‌ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخۡصِفٰنِ عَلَيۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَـنَّةِ‌ ؕ وَنَادٰٮهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمۡ اَنۡهَكُمَا عَنۡ تِلۡكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّـكُمَاۤ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَـكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٚ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَـنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَـنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۲۳﴾

وجہ اِس کے سِوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا تمھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔" اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمھارا سچا خیر خواہ ہوں۔

اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انھوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کُھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنّت کے پتّوں سے ڈھانکنے لگے۔

تب ان کے رب نے انھیں پکارا: "کیا میں نے تمھیں اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے؟"

دونوں بول اُٹھے: "اے رب! ہم نے اپنے اُوپر ستم کیا، اب اگر تُو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں[۱۳] گے۔"

---

۱۳ – اس قصّے سے چند اہم حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) انسان کے اندر شرم وحیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اوّلین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصّوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرتاً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقا سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے، جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے، بلکہ

درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اوّل روز سے انسان میں موجود تھی۔

(۲) شیطان کی پہلی چال جو اس نے انسان کو فطرتِ انسانی کی سیدھی راہ سے ہٹانے کے لیے چلی، یہ تھی کہ اُس کے اِس جذبۂ شرم وحیا پر ضرب لگائے اور برہنگی کے راستے سے اس کے لیے فواحش کا دروازہ کھولے اور اس کو جنسی معاملات میں بدراہ کردے۔ بالفاظِ دیگر، اپنے حریف کے محاذ میں ضعیف ترین مَقام جو اس نے حملے کے لیے تلاش کیا وہ اس کی زندگی کا جنسی پہلو تھا، اور پہلی ضرب جو اس نے لگائی وہ اُس محافظِ فصیل پر لگائی جو شرم وحیا کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھی تھی۔ شیاطین اور ان کے شاگردوں کی یہ رَوِش آج تک جوں کی توں قائم ہے۔ ’’ترقی‘‘ کا کوئی کام ان کے ہاں شروع نہیں ہوسکتا جب تک کہ عورت کو بے پردہ کرکے وہ بازار میں نہ لا کھڑا کریں اور اُسے کسی نہ کسی طرح عُریاں نہ کردیں۔

(۳) یہ بھی انسان کی عین فطرت ہے کہ وہ بُرائی کی کھلی دعوت کو کم ہی قبول کرتا ہے۔ عُموماً اُسے جال میں پھانسنے کے لیے ہر داعیِ شر کو خیر خواہ کے بھیس ہی میں آنا پڑتا ہے۔

(۴) انسان کے اندر معالی اُمور مثلاً بشریت سے بالاتر مَقام پر پہنچنے یا حیاتِ جاوداں حاصل کرنے کی ایک فطری پیاس موجود ہے، اور شیطان کو اُسے فریب دینے میں پہلی کامیابی اِسی ذریعے سے ہوئی کہ اس نے انسان کی اِس خواہش سے اپیل کیا۔ شیطان کا سب سے زیادہ چلتا ہوا حربہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو بلندی پر لے جانے اور موجودہ حالت سے بہتر حالت پر پہنچا دینے کی اُمید دلاتا ہے، اور پھر اُس کے لیے وہ راستہ پیش کرتا ہے جو اُسے اُلٹا پستی کی طرف لے جائے۔

(۵) عام طور پر یہ جو مشہور ہوگیا ہے کہ شیطان نے پہلے حضرت حوّا کو دامِ فریب میں گرفتار کیا اور پھر انھیں حضرت آدمؑ کو پھانسنے کے لیے آلۂ کار بنایا، قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ شیطان نے دونوں کو دھوکا دیا اور دونوں اس سے دھوکا کھا گئے۔ بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت حوّا کے متعلق اس مشہور رِوایَت نے دنیا میں عورت کے اَخلاقی، قانونی اور معاشرتی مرتبے کو گرانے میں کتنا زبردست حصّہ لیا ہے، وہی قرآن کے اس بیان کی حقیقی قدر وقیمت سمجھ سکتے ہیں۔

(۶) یہ گمان کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے کہ شجرِ ممنوعہ کا مزا چکھتے ہی آدم وحوّا کے ستر کُھل جانا اُس درخت کی کسی خاصیّت کا نتیجہ تھا۔ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سوا کسی اور چیز کا نتیجہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کا ستر اپنے انتظام سے ڈھانکا تھا۔ جب انھوں نے حکم کی خلاف ورزی کی تو خدا کی حفاظت اُن سے ہٹالی گئی، اُن کا پردہ کھول دیا گیا اور انھیں خود اُن کے اپنے نفس کے حوالے کردیا گیا کہ اپنی پردہ پوشی کا انتظام خود کریں اگر اس کی ضرورت سمجھتے ہیں، اور اگر ضرورت نہ سمجھیں یا اس کے لیے سعی نہ کریں تو خدا کو اِس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کس حال میں پھرتے ہیں۔ یہ گویا ہمیشہ کے لیے اس حقیقت کا مظاہرہ تھا کہ انسان جب خدا کی نافرمانی کرے گا تو دیر یا سویر اس کا پردہ کھل کر رہے گا۔ اور یہ کہ انسان کے ساتھ خدا کی تائید وحمایت اسی وقت تک رہے گی جب تک وہ خدا کا مطیع فرمان رہے گا۔ طاعت کے حُدود سے قدم باہر نکالنے کے بعد اسے خدا کی تائید ہرگز حاصل نہ ہوگی، بلکہ اسے خود اس کے اپنے نفس کے حوالے کردیا جائے گا۔ یہ وہی مضمون ہے جو متعدّد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، اور اسی کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے کہ اللھم رحمتك ارجوا فلا تکلنی الی نفسی

طرفۃ عین (خدایا! میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں، پس مجھے ایک لمحے کے لیے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر)۔

(۷) شیطان یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ انسان اُس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو اُس کے مقابلے میں انسان کو دی گئی ہے۔لیکن پہلے ہی معرکے میں اس نے شکست کھائی۔ اس میں شک نہیں کہ اس معرکے میں انسان اپنے رب کے امر کی فرماں برداری کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا، اور اس کی یہ کمزوری ظاہر ہوگئی کہ وہ اپنے حریف کے فریب میں آکر اطاعت کی راہ سے ہٹ سکتا ہے۔مگر بہرحال اس اوّلین مقابلے میں یہ قطعی ثابت ہوگیا کہ انسان اپنے اَخلاقی مرتبے میں ایک افضل مخلوق ہے۔ اولاً، شیطان اپنی بڑائی کا خود مدعی تھا، اور انسان نے اس کا دعویٰ آپ نہیں کیا بلکہ بڑائی اسے دی گئی۔ ثانیاً، شیطان نے خالص غرور و تکبر کی بنا پر اللہ کے امر کی نافرمانی آپ اپنے اختیار سے کی، اور انسان نے نافرمانی کو خود اختیار نہیں کیا بلکہ شیطان کے بہکانے سے وہ اس میں مبتلا ہوا۔ ثالثاً: انسان نے شر کی کھلی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ داعیِ شر کو داعیِ خیر بن کر اس کے سامنے آنا پڑا۔ وہ پستی کی طرف پستی کی طلب میں نہیں گیا بلکہ اِس دھوکے میں مبتلا ہو کر گیا کہ یہ راستہ اُسے بلندی کی طرف لے جائے گا۔ رابعاً، شیطان کو تنبیہ کی گئی تو وہ اپنے قصور کا اعتراف کرنے اور بندگی کی طرف پلٹ آنے کے بجائے نافرمانی پر اور زیادہ جم گیا، اور جب انسان کو اس کے قُصور پر مُتنَبِّہ کیا گیا تو اس نے شیطان کی طرح سرکشی نہیں کی بلکہ اپنی غَلَطی کا احساس ہوتے ہی وہ نادم ہوا، اپنے قصور کا اعتراف کر کے بغاوت سے اطاعت کی طرف پلٹ آیا اور معافی مانگ کر اپنے رب کے دامنِ رحمت میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔

(۸) اس طرح شیطان کی راہ اور وہ راہ جو انسان کے لائق ہے، دونوں ایک دوسرے سے بالکل متمیّز ہوگئیں۔ خالص شیطانی راہ یہ ہے کہ بندگی سے منہ موڑے، خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرے، مُتنَبِّہ کیے جانے کے باوجود پورے اِستکبار کے ساتھ اپنے باغیانہ طرزِ عمل پر اصرار کیے چلا جائے، اور جو لوگ طاعت کی راہ چل رہے ہوں ان کو بھی بہکائے اور معصیت کی راہ پر لانے کی کوشش کرے۔ بخلاف اس کے جو راہ انسان کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ شیطانی اغوا کی مزاحمت کرے اور اپنے اس دشمن کی چالوں کو سمجھنے اور اُن سے بچنے کے لیے ہر وقت چوکنّا رہے، لیکن اگر کبھی اس کا قدم بندگی و طاعت کی راہ سے ہٹ بھی جائے تو اپنی غَلَطی کا احساس ہوتے ہی ندامت و شرمساری کے ساتھ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے اور اُس قصور کی تلافی کردے جو اس سے سرزد ہوگیا ہے۔ یہی وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اس قصّے سے یہاں دینا چاہتا ہے۔ ذہن نشین یہ کرنا مقصود ہے کہ جس راہ پر تم لوگ جا رہے ہو یہ شیطان کی راہ ہے۔ یہ تمھارا خدائی ہدایت سے بے نیاز ہو کر شیاطینِ جن واِنس کو اپنا ولی وسرپرست بنانا، اور یہ تمھارا پے در پے تنبیہات کے باوجود اپنی غلطی پر اصرار کیے چلے جانا، یہ دراصل خالص شیطانی رَوِیَّہ ہے۔تم اپنے اَزَلی دشمن کے دام میں گرفتار ہوگئے ہو اور اس سے مکمل شکست کھا رہے ہو۔ اس کا انجام پھر وہی ہے جس سے شیطان خود دوچار ہونے والا ہے۔ اگر تم حقیقت میں خود اپنے دشمن نہیں ہوگئے ہو اور کچھ بھی ہوش تم میں باقی ہے تو سنبھلو اور وہ راہ اختیار کرو جو آخرِ کار تمھارے باپ اور تمھاری ماں آدم وحوّا نے اختیار کی تھی۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ

ع ۲ / ۱۵ / ۹

فرمایا: ”اتر جاؤ[۱۴]، تم ایک دُوسرے کے دشمن ہو، اور تمھارے لیے ایک خاص مدّت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامانِ زِیست ہے۔“ اور فرمایا: ”وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اسی میں سے تم کو آخرِ کار نکالا جائے گا۔“ ع

اے اولادِ آدم[۱۵]! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمھارے جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو ڈھانکے

۱۴ – یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضرت آدم وحوّا علیہما السلام کو جنّت سے اُتر جانے کا یہ حکم سزا کے طور پر دیا گیا تھا۔ قرآن میں متعدّد مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور انھیں معاف کر دیا۔ لہٰذا اس حکم میں سزا کا کوئی پہلو نہیں ہے، بلکہ یہ اُس منشا کی تکمیل ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا تھا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۴۸ و ۵۳)

۱۵ – اب قصۂ آدم وحوّا کے ایک خاص پہلو کی طرف توجّہ منعطف کر کے اہلِ عرب کے سامنے خود اُن کی اپنی زندگی کے اندر شیطانی اغوا کے ایک نمایاں ترین اثر کی نشان دِہی فرمائی جاتی ہے۔ یہ لوگ لباس کو صرف زینت اور موسمی اثرات سے جسم کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے تھے، لیکن اس کی سب سے پہلی بنیادی غرض، یعنی جسم کے قابلِ شرم حصوں کی پردہ پوشی اُن کے نزدیک کوئی اہمیّت نہ رکھتی تھی۔ انھیں اپنے ستر دوسروں کے سامنے کھول دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ برہنہ منظرِ عام پر نہا لینا، راہ چلتے قضائے حاجت کے لیے بیٹھ جانا، ازار کھل جائے تو ستر کے بے پردہ ہو جانے کی پروانہ کرنا اُن کے شب و روز کے معمولات تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں سے بکثرت لوگ حج کے موقع پر کعبے کے گرد برہنہ طواف کرتے تھے، اور اس معاملے میں ان کی عورتیں ان کے مردوں سے بھی کچھ زیادہ بے حیا تھیں۔ ان کی نگاہ میں یہ ایک مذہبی فعل تھا اور نیک کام سمجھ کر وہ اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ پھر چونکہ یہ کوئی عربوں ہی کی خصوصیّت نہ تھی، دُنیا کی اکثر قومیں اسی بے حیائی میں مبتلا رہی ہیں اور آج تک ہیں، اس لیے خطاب اہلِ عرب کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ عام ہے، اور سارے بنی آدم کو مُتنبِّہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھو، یہ شیطانی اغوا کی ایک کھلی ہوئی علامت تمھاری زندگی میں موجود ہے۔ تم نے اپنے رب کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اور اس کے رسولوں کی دعوت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا، اور اس نے تمھیں انسانی فطرت کے راستے سے ہٹا کر اُسی بے حیائی میں مبتلا کر دیا جس میں وہ تمھارے پہلے باپ اور ماں کو مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ اس پر غور کرو تو یہ حقیقت تم پر کُھل جائے کہ رسولوں کی

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿٢٦﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٢٧﴾

اور تمھارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو، اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔ اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمھیں پھر اُسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمھارے والدین کو جنّت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اُتروا دیے تھے تاکہ ان کی شرم گاہیں ایک دُوسرے کے سامنے کھولے۔ وہ اور اس کے ساتھی تمھیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ اِن شیاطین کو ہم نے اُن لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔[16]

رہنمائی کے بغیر تم اپنی فطرت کے ابتدائی مطالبات تک کو نہ سمجھ سکتے ہو اور نہ پورا کر سکتے ہو۔

۱۶ – ان آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے، اس سے چند اہم حقیقتیں نکھر کر سامنے آ جاتی ہیں:

اوّل یہ کہ لباس انسان کے لیے ایک مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح کوئی پوشش پیدائشی طور پر نہیں رکھی بلکہ حیا اور شرم کا مادّہ اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا۔ اس نے انسان کے لیے اُس کے اعضائے صنفی کو محض اعضائے صنفی ہی نہیں بنایا بلکہ سَوْاَۃٌ بھی بنایا، جس کے معنیٰ عَرَبی زبان میں ایسی چیز کے ہیں جس کے اظہار کو آدمی قبیح سمجھے۔ پھر اس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اس نے کوئی بنا بنایا لباس انسان کو نہیں دے دیا بلکہ اس کی فطرت پر لباس کا الہام کیا (اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا)، تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر اپنی فطرت کے اِس مطالبے کو سمجھے اور پھر اللہ کے پیدا کردہ مواد سے کام لے کر اپنے لیے لباس فراہم کرے۔

دوم یہ کہ اس فطری الہام کی رُو سے انسان کے لیے لباس کی اخلاقی ضرورت مُقدّم ہے، یعنی یہ کہ وہ اپنی سَوْاَۃٌ کو ڈھانکے۔

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا

یہ لوگ جب کوئی شرم ناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے[17]۔ اِن سے کہو: اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا[18]۔ کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلّق

اور اس کی طبعی ضرورت موٴخّر ہے، یعنی یہ کہ اس کا لباس اس کے لیے رِیش (جسم کی آرایش اور موسمی اثرات سے بدن کی حفاظت کا ذریعہ) ہو۔ اس باب میں بھی فطرتاً انسان کا معاملہ حیوانات کے برعکس ہے۔ اُن کے لیے پوشش کی اصل غرض صرف اس کا ''رِیش'' ہونا ہے، رہا اس کا ستر پوش ہونا، تو اُن کے اعضائے صِنفی سرے سے سَوْاٰۃ ہی نہیں ہیں کہ انھیں چھپانے کے لیے حیوانات کی جِبِلّت میں کوئی داعیہ موجود ہوتا اور اس کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ان کے اجسام پر کوئی لباس پیدا کیا جاتا۔ لیکن جب انسانوں نے شیطان کی رہنمائی قبول کی تو معاملہ پھر اُلٹ گیا۔ اس نے اپنے ان شاگردوں کو اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ تمھارے لیے لباس کی ضرورت بعینہٖ وہی ہے جو حیوانات کے لیے رِیش کی ضرورت ہے، رہا اس کا سَوْاٰۃ کو چھپانے والی چیز ہونا، تو یہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ جس طرح حیوانات کے اعضا سَوْاٰۃ نہیں ہیں، اسی طرح تمھارے یہ اعضا بھی سَوْاٰۃ نہیں، محض اعضائے صِنفی ہی ہیں۔

سوم یہ کہ انسان کے لیے لباس کا صرف ذریعۂ ستر پوشی اور وسیلۂ زینت و حفاظت ہونا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت اس معاملے میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو، یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو، زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو، فخر و غرور اور تکبر و ریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو، اور پھر اُن ذہنی امراض کی نمایندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں، عورتیں مردانہ پن کی نمایش کرنے لگتی ہیں، اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کر کے خود اپنی ذلت کا زندہ اشتہار بن جاتی ہے۔ لباس کے معاملے میں اِس خیرِ مطلوب کو پہنچنا تو کسی طرح اُن لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جنھوں نے انبیا علیہم السلام پر ایمان لا کر اپنے آپ کو بالکل خدا کی رہنمائی کے حوالے نہیں کر دیا ہے۔ جب وہ خدا کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو شیاطین ان کے سرپرست بنا دیے جاتے ہیں، پھر یہ شیاطین ان کو کسی نہ کسی غَلَطی میں مبتلا کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔

چہارم یہ کہ لباس کا معاملہ بھی اللہ کی اُن بے شمار نشانیوں میں سے ایک ہے جو دُنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں۔ بشرطیکہ انسان خود ان سے سبق لینا چاہے۔ اُوپر جن حقائق کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، انھیں اگر تأمُّل کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ لباس کس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کا ایک اہم نشان ہے۔

تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۭ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾

تمھیں علم نہیں ہے (کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں؟) اے محمدؐ! ان سے کہو: میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے، اور اس کا حکم تو یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رُخ ٹھیک رکھو اور اُسی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھ کر۔ جس طرح اُس نے تمھیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کیے[19] جاؤ گے۔

۱۷ – اشارہ ہے اہلِ عرب کے برہنہ طواف کی طرف، جس کا ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں۔ وہ لوگ اس کو ایک مذہبی فعل سمجھ کر کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ خدا نے یہ حکم دیا ہے۔

۱۸ – بظاہر یہ ایک بہت ہی مختصر سا جملہ ہے مگر درحقیقت اس میں قرآنِ مجید نے ان لوگوں کے جاہلانہ عقائد کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل پیش کی ہے۔ اس طرزِ اِستدلال کو سمجھنے کے لیے دو باتیں بطورِ مُقدّمہ کے پہلے سمجھ لینی چاہییں:

ایک یہ کہ اہلِ عرب اگرچہ اپنی بعض مذہبی رسموں میں برہنگی اختیار کرتے تھے اور اسے ایک مقدس مذہبی فعل سمجھتے تھے، لیکن برہنگی کا بجائے خود ایک شرم ناک فعل ہونا خود ان کے نزدیک بھی مسلّم تھا۔ چنانچہ کوئی شریف اور ذی عزت عرب اس بات کو پسند نہ کرتا تھا کہ کسی مہذب مجلس میں، یا بازار میں، یا اپنے اعزّہ اور اقربا کے درمیان برہنہ ہو۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگ برہنگی کو شرم ناک جاننے کے باوجود ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے اپنی عبادت کے موقع پر اختیار کرتے تھے، اور چونکہ اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے، اس لیے ان کا دعویٰ تھا کہ یہ رسم بھی خدا ہی کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہے۔ اس پر قرآنِ مجید یہ اِستدلال کرتا ہے کہ جو کام فحش ہے اور جسے تم خود بھی جانتے اور مانتے ہو کہ فحش ہے اس کے متعلق تم یہ کیسے باور کر لیتے ہو کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہوگا۔ کسی فحش کام کا حکم خدا کی طرف سے ہرگز نہیں ہوسکتا، اور اگر تمھارے مذہب میں ایسا حکم پایا جاتا ہے تو یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ تمھارا مذہب خدا کی طرف سے نہیں ہے۔

۱۹ – مطلب یہ ہے کہ خدا کے دین کو تمھاری ان بے ہودہ رسموں سے کیا تعلق۔ اس نے جس دین کی تعلیم دی ہے اس کے بنیادی اُصول تو یہ ہیں کہ:

(۱) انسان اپنی زندگی کو عدل و راستی کی بنیاد پر قائم کرے۔

(۲) عبادت میں اپنا رُخ ٹھیک رکھے، یعنی خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کا شائبہ تک اس کی عبادت میں نہ ہو، معبودِ حقیقی کے سوا کسی دوسرے کی طرف اطاعت و غلامی اور عجز و نیاز کا رخ ذرا نہ پھرنے پائے۔

(۳) رہنمائی اور تائید و نصرت اور نگہبانی و حفاظت کے لیے خدا ہی سے دُعا مانگے، مگر شرط یہ ہے کہ اس چیز کی دُعا مانگنے والا آدمی پہلے اپنے دین کو خدا کے لیے خالص کر چکا ہو۔ یہ نہ ہو کہ زندگی کا سارا نظام تو کفر و شرک اور معصیت اور

فَرِيۡقًا هَدٰى وَفَرِيۡقًا حَقَّ عَلَيۡهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿۳۰﴾ يٰبَنِىۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا وَلَا تُسۡرِفُوۡا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ﴿۳۱﴾ ع

ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے، کیونکہ انھوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنا لیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں۔

اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو[20] اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[21] ع

بندگیِ اغیار پر چلایا جا رہا ہو اور مدد خدا سے مانگی جائے کہ اے خدا! یہ بغاوت جو ہم تجھ سے کر رہے ہیں، اس میں ہماری مدد فرما۔

(۴) اور اس بات پر یقین رکھے کہ جس طرح اس دنیا میں وہ پیدا ہُوا ہے، اسی طرح ایک دوسرے عالَم میں بھی اس کو پیدا کیا جائے گا اور اسے اپنے اعمال کا حساب خدا کو دینا ہوگا۔

۲۰ – یہاں زینت سے مراد مکمل لباس ہے۔ خدا کی عبادت میں کھڑے ہونے کے لیے صرف اِتنا ہی کافی نہیں ہے کہ آدمی محض اپنا ستر چھُپا لے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حسبِ استطاعت وہ اپنا پورا لباس پہنے جس میں ستر پوشی بھی ہو اور زینت بھی۔ یہ حکم اُس غلط رَوِیّے کی تردید کے لیے ہے جس پر جُہلا اپنی عبادتوں میں عمل کرتے رہے ہیں اور آج تک کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بَرَہنہ یا نیم برہنہ ہو کر اور اپنی ہیئتوں کو بگاڑ کر خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔ اس کے برعکس خدا کہتا ہے کہ اپنی زینت سے آراستہ ہو کر ایسی وضع میں عبادت کرنی چاہیے جس کے اندر برہنگی تو کیا، ناشائستگی کا بھی شائبہ تک نہ ہو۔

۲۱ – یعنی خدا کو تمھاری خستہ حالی اور فاقہ کشی اور طیّباتِ رزق سے محرومی عزیز نہیں ہے کہ اس کی بندگی بجا لانے کے لیے یہ کسی درجے میں بھی مطلوب ہو۔ بلکہ اس کی عین خوشی یہ ہے کہ تم اس کے بخشے ہوئے عمدہ لباس پہنو اور پاک رزق سے متمتع ہو۔ اس کی شریعت میں اصل گناہ یہ ہے کہ آدمی اس کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے، خواہ یہ تجاوز حلال کو

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ

اے محمدؐ! اِن سے کہو: کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں[۲۲]؟ کہو: یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں، اور قیامت کے روز تو خالصتاً انھی کے لیے ہوں گی[۲۳]۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے

حرام کر لینے کی شکل میں ہو، یا حرام کو حلال کر لینے کی شکل میں۔

۲۲ – مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو دُنیا کی ساری زینتیں اور پاکیزہ چیزیں بندوں ہی کے لیے پیدا کی ہیں، اس لیے اللہ کا منشا تو بہرحال یہ نہیں ہو سکتا کہ انھیں بندوں کے لیے حرام کر دے۔ اب اگر کوئی مذہب یا کوئی نظامِ اخلاق و معاشرت ایسا ہے جو انھیں حرام، یا قابلِ نفرت، یا ارتقائے روحانی میں سدِّ راہ قرار دیتا ہے تو اس کا یہ فعل خود ہی اس بات کا کُھلا ثبوت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ یہ بھی اُن حجتوں میں سے ایک اہم حجت ہے جو قرآن نے مذاہبِ باطلہ کے رَدّ میں پیش کی ہیں، اور اس کو سمجھ لینا قرآن کے طرزِ اِستدلال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

۲۳ – یعنی حقیقت کے اعتبار سے تو خدا کی پیدا کردہ تمام چیزیں دُنیا کی زندگی میں بھی اہلِ ایمان ہی کے لیے ہیں، کیونکہ وہی خدا کی وفادار رعایا ہیں، اور حقِ نمک صرف نمک حلالوں ہی کو پہنچتا ہے۔ لیکن دُنیا کا موجودہ انتظام چونکہ آزمایش اور مہلت کے اُصول پر قائم کیا گیا ہے، اس لیے یہاں اکثر خدا کی نعمتیں نمک حراموں پر بھی تقسیم ہوتی رہتی ہیں اور بسا اوقات نمک حلالوں سے بڑھ کر انھیں نعمتوں سے نواز دیا جاتا ہے۔ البتہ آخرت میں (جہاں کا سارا انتظام خالص حق کی بنیاد پر ہوگا) زندگی کی آرایشیں اور رزق کے طیّبات سب کے سب محض نمک حلالوں کے لیے مخصوص ہوں گے اور وہ نمک حرام ان میں سے کچھ نہ پاسکیں گے جنھوں نے اپنے رب کے رزق پر پلنے کے بعد اپنے رب ہی کے خلاف سرکشی کی۔

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْىَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

کام ـــــ خواہ کُھلے ہوں یا چُھپے[۲۴] ـــــ اور گناہ[۲۵] اور حق کے خلاف زیادتی[۲۶]، اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی کو شریک کرو جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی، اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلّق تمھیں علم نہ ہو کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے۔

ہر قوم کے لیے مُہلت کی ایک مدّت مقرر ہے، پھر جب کسی قوم کی مدّت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی۔[۲۷] (اور یہ بات اللہ نے آغازِ تخلیق ہی میں صاف فرما دی تھی کہ)

۲۴- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ انعام، حواشی ۱۲۸ و ۱۳۱۔

۲۵- اصل میں لفظ اِثْم استعمال ہُوا ہے جس کے اصل معنیٰ کوتاہی کے ہیں۔ اٰثِمَہ اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تیز چل سکتی ہو مگر جان بُوجھ کر سُست چلے۔ اسی سے اس لفظ میں گناہ کا مفہُوم پیدا ہُوا ہے، یعنی انسان کا اپنے رب کی اطاعت وفرماں برداری میں قدرت و استطاعت کے باوجود کوتاہی کرنا اور اس کی رضا کو پہنچنے میں جان بُوجھ کر قصور دکھانا۔

۲۶- یعنی اپنی حد سے تجاوز کر کے ایسے حُدود میں قدم رکھنا جن کے اندر داخل ہونے کا آدمی کو حق نہ ہو۔ اس تعریف کی رُو سے وہ لوگ بھی باغی قرار پاتے ہیں جو بندگی کی حد سے نکل کر خدا کے ملک میں خود مختارانہ رَویّہ اختیار کرتے ہیں، اور وہ بھی جو خدا کی خدائی میں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجاتے ہیں، اور وہ بھی جو بندگانِ خدا کے حُقوق پر دست درازی کرتے ہیں۔

۲۷- مُہلت کی مدّت مقرر کیے جانے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہر قوم کے لیے برسوں اور مہینوں اور دنوں کے لحاظ سے ایک عمر مقرر کی جاتی ہو اور اس عمر کے تمام ہوتے ہی اس قوم کو لازماً ختم کر دیا جاتا ہو۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر قوم کو دُنیا میں کام کرنے کا جو موقع دیا جاتا ہے اس کی ایک اخلاقی حد مقرر کر دی جاتی ہے، بایں معنیٰ کہ اس کے اعمال میں خیر اور شر کا کم سے کم کتنا تناسُب برداشت کیا جا سکتا ہے۔ جب تک ایک قوم کی بُری صفات اس کی اچھی صفات کے مقابلے میں تناسُب کی اُس آخری حد سے فروتر رہتی ہیں اُس وقت تک اُسے اس کی تمام بُرائیوں کے باوجود مُہلت دی جاتی رہتی ہے، اور جب وہ اس حد سے

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْۤا اَيْنَ

اے بنی آدم! یاد رکھو، اگر تمھارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمھیں میری آیات سُنا رہے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رَوِیّے کی اصلاح کر لے گا، اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے، اور جو لوگ ہماری آیات کو جُھٹلائیں گے اور ان کے مقابلے میں سرکشی برتیں گے، وہی اہلِ دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں[28] گے۔ ظاہر ہے کہ اُس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو بالکل جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی سچّی آیات کو جُھٹلائے۔ ایسے لوگ اپنے نَوِشتۂ تقدیر کے مطابق اپنا حصّہ پاتے رہیں[29] گے، یہاں تک کہ وہ گھڑی آجائے گی جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی رُوحیں قبض کرنے کے لیے پہنچیں گے۔ اُس وقت وہ اُن سے پوچھیں گے کہ بتاؤ، اب کہاں ہیں

گزر جاتی ہیں تو پھر اس بدکار و بدصفات قوم کو مزید کوئی مُہلت نہیں دی جاتی۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے سورۂ نوح، آیات ۴-۱۰-۱۲ نگاہ میں رکھیے۔

۲۸ – یہ بات قرآنِ مجید میں ہر جگہ اُس موقع پر ارشاد فرمائی گئی ہے جہاں آدم وحوّا علیہما السلام کے جنت سے اُتارے جانے کا ذکر آیا ہے (مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، آیات ۳۸-۳۹۔ طٰہٰ، آیات ۱۲۳-۱۲۴)، لہٰذا یہاں بھی اس کو اسی موقع سے متعلق سمجھا جائے گا، یعنی نوعِ انسانی کی زندگی کا آغاز جب ہو رہا تھا اُسی وقت یہ بات صاف طور پر سمجھا دی گئی تھی۔ (ملاحظہ ہو: سورۂ آلِ عمران، حاشیہ ۶۹)

۲۹ – یعنی دُنیا میں جتنے دن ان کی مُہلت کے مقرر ہیں، یہاں رہیں گے، اور جس قسم کی بظاہر اچھی یا بُری زندگی گزارنا اُن کے نصیب میں ہے، گزار لیں گے۔

مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِى النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَاۤءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

تمھارے وہ معبود جن کو تم خدا کے بجائے پکارتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ "سب ہم سے گُم ہو گئے۔" اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ ہم واقعی منکرِ حق تھے۔ اللہ فرمائے گا: جاؤ، تم بھی اسی جہنّم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے گروہِ جن و انس جا چکے ہیں۔ ہر گروہ جب جہنّم میں داخل ہو گا تو اپنے پیش رَو گروہ پر لعنت کرتا ہُوا داخل ہو گا، حتّٰی کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب! یہ لوگ تھے جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا لہٰذا انھیں آگ کا دُہرا عذاب دے۔ جواب میں ارشاد ہو گا: ہر ایک کے لیے دُہرا ہی عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔[۳۰]

۳۰- یعنی بہر حال تم میں سے ہر گروہ کسی کا خَلَف تھا تو کسی کا سَلَف بھی تھا۔ اگر کسی گروہ کے اسلاف نے اُس کے لیے فکر و عمل کی گمراہیوں کا وِرثہ چھوڑا تھا تو خود وہ بھی اپنے اخلاف کے لیے ویسا ہی وِرثہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوا۔ اگر ایک گروہ کے گمراہ ہونے کی کچھ ذمہ داری اس کے اسلاف پر عائد ہوتی ہے تو اس کے اخلاف کی گمراہی کا اچھا خاصا بار خود اس پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا کہ ہر ایک کے لیے دُہرا عذاب ہے۔ ایک عذاب خود گمراہی اختیار کرنے کا، اور دوسرا عذاب دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔ ایک سزا اپنے جرائم کی اور دوسری سزا دوسروں کے لیے جرائم پیشگی کی میراث چھوڑ آنے کی۔

حدیث میں اِسی مضمون کی توضیح یوں بیان فرمائی گئی ہے کہ من ابتدع بدعة ضلالةٍ لا یرضاھا اللّٰہ

ورسولہ کان علیہ من الاثم مثل اٰثام من عمل بھا لا ینقص ذٰلک من اوزارھم شیئا۔ یعنی جس نے کسی نئی گمراہی کا آغاز کیا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک ناپسندیدہ ہو، تو اس پر ان سب لوگوں کے گناہ کی ذمّہ داری عائد ہوگی جنھوں نے اس کے نکالے ہوئے طریقے پر عمل کیا، بغیر اس کے کہ خود ان عمل کرنے والوں کی ذمّہ داری میں کوئی کمی ہو۔ دوسری حدیث میں ہے: لا تقتل نفس ظلما الا کان علی ابن اٰدم الاوّل کفل من دمھا لانہ اوّل من سن القتل۔ یعنی دنیا میں جو انسان بھی ظلم کے ساتھ قتل کیا جاتا ہے اس کے خونِ ناحق کا ایک حصّہ آدمؑ کے اُس پہلے بیٹے کو پہنچتا ہے جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا، کیونکہ قتلِ انسان کا راستہ سب سے پہلے اسی نے کھولا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص یا گروہ کسی غلط خیال یا غلط رَوِیّے کی بِنا ڈالتا ہے، وہ صرف اپنی ہی غَلَطی کا ذمّہ دار نہیں ہوتا، بلکہ دنیا میں جتنے انسان اس سے مُتأثِّر ہوتے ہیں اُن سب کے گناہ کی ذمّہ داری کا بھی ایک حصّہ اس کے حساب میں لکھا جاتا رہتا ہے، اور جب تک اس کی اس غلطی کے اثرات چلتے رہتے ہیں اُس کے حساب میں ان کا اندراج ہوتا رہتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنی نیکی یا بدی کا صرف اپنی ذات کی حد تک ہی ذمّہ دار نہیں ہے بلکہ اس امر کا بھی جواب دہ ہے کہ اس کی نیکی یا بدی کے کیا اثرات دوسروں کی زندگیوں پر مُترتّب ہوئے۔

مثال کے طور پر ایک زانی کو لیجیے۔ جن لوگوں کی تعلیم و تربیّت سے، جن کی صحبت کے اثر سے، جن کی بُری مثالیں دیکھنے سے، اور جن کی ترغیبات سے اس شخص کے اندر زِناکاری کی صفت نے ظہور کیا، وہ سب اس کے زناکار بننے میں حصّہ دار ہیں۔ اور خود اُن لوگوں نے اُوپر جہاں جہاں سے اس بدنظری و بدنیتی اور بدکاری کی میراث پائی ہے، وہاں تک اس کی ذمّہ داری پہنچتی ہے، حتّٰی کہ یہ سلسلہ اُس اوّلین انسان پر منتہی ہوتا ہے جس نے سب سے پہلے نوعِ انسانی کو خواہشِ نفس کی تسکین کا یہ غلط راستہ دکھایا۔ یہ اُس زانی کے حساب کا وہ حصّہ ہے جو اس کے ہم عصروں اور اس کے اسلاف سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر وہ خود بھی اپنی زِناکاری کا ذمہ دار ہے۔ اُس کو بھلے اور بُرے کی جو تمیز دی گئی تھی، اس میں ضمیر کی جو طاقت رکھی گئی تھی، اس کے اندر ضبطِ نفس کی جو قوت ودیعت کی گئی تھی، اس کو نیک لوگوں سے خیر وشر کا جو علم پہنچا تھا، اس کے سامنے اخیار کی جو مثالیں موجود تھیں، اس کو صنفی بدعملی کے بُرے نتائج سے جو واقفیت تھی، ان میں سے کسی چیز سے بھی اس نے فائدہ نہ اُٹھایا اور اپنے آپ کو نفس کی اُس اندھی خواہش کے حوالے کر دیا جو صرف اپنی تسکین چاہتی تھی، خواہ وہ کسی طریقے سے ہو۔ یہ اس کے حساب کا وہ حصّہ ہے جو اس کی اپنی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر یہ شخص اُس بدی کو، جس کا اکتساب اس نے کیا اور جسے خود اپنی سعی سے وہ پرورش کرتا رہا، دوسروں میں پھیلانا شروع کرتا ہے۔ کسی مرضِ خبیث کی چھوت کہیں سے لگا لاتا ہے اور اسے اپنی نسل میں اور خدا جانے کن کن نسلوں میں پھیلا کر نہ معلوم کتنی زندگیوں کو خراب کر دیتا ہے۔ کہیں اپنا نطفہ چھوڑ آتا ہے اور جس بچے کی پرورش کا بار اسے خود اُٹھانا چاہیے تھا اسے کسی اور کی کمائی کا ناجائز حصّہ دار، اس کے بچوں کے حُقوق میں زبردستی کا شریک، اس کی میراث میں ناحق کا حق دار بنا دیتا ہے، اور اس حق تلفی کا سلسلہ نہ معلوم کتنی نسلوں تک چلتا رہتا ہے۔ کسی دوشیزہ لڑکی کو پُھسلا کر بداخلاقی کی راہ پر ڈالتا ہے اور اس کے اندر وہ بُری صفات اُبھار دیتا ہے جو اس سے منعکس ہو کر نہ معلوم کتنے خاندانوں اور کتنی نسلوں تک پہنچتی ہیں اور کتنے گھر بگاڑ دیتی ہیں۔ اپنی اولاد، اپنے اقارب، اپنے دوستوں اور اپنی سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے سامنے اپنے

اخلاق کی ایک بُری مثال پیش کرتا ہے اور نہ معلوم کتنے آدمیوں کے چال چلن خراب کرنے کا سبب بن جاتا ہے، جس کے اثرات بعد کی نسلوں میں مدّت ہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں۔ یہ سارا فساد جو اس شخص نے سوسائٹی میں برپا کیا، انصاف چاہتا ہے کہ یہ بھی اس کے حساب میں لکھا جائے اور اُس وقت تک لکھا جاتا رہے جب تک اس کی پھیلائی ہوئی خرابیوں کا سلسلہ دنیا میں چلتا رہے۔

اسی پر نیکی کو بھی قیاس کر لینا چاہیے۔ جو نیک وِرثہ اپنے اسلاف سے ہم کو ملا ہے اُس کا اجر اُن سب لوگوں کو پہنچنا چاہیے جو ابتدائے آفرینش سے ہمارے زمانے تک اُس کے منتقل کرنے میں حصہ لیتے رہے ہیں پھر اس ورثے کو لے کر اسے سنبھالنے اور ترقی دینے میں جو خدمت ہم انجام دیں گے اس کا اجر ہمیں بھی ملنا چاہیے۔ پھر اپنی سعیِ خیر کے جو نقوش و اثرات ہم دُنیا میں چھوڑ جائیں گے انھیں بھی ہماری بھلائیوں کے حساب میں اس وقت تک برابر درج ہوتے رہنا چاہیے جب تک یہ نقوش باقی رہیں، اور ان کے اثرات کا سلسلہ نوعِ انسانی میں چلتا رہے اور ان کے فوائد سے خلقِ خدا متمتع ہوتی رہے۔

جزا کی یہ صورت جو قرآن پیش کر رہا ہے، ہر صاحبِ عقل انسان تسلیم کرے گا کہ صحیح اور مکمل انصاف اگر ہو سکتا ہے تو اِسی طرح ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس سے اُن لوگوں کی غلط فہمیاں بھی دُور ہو سکتی ہیں جنھوں نے جزا کے لیے اِسی دُنیا کی موجودہ زندگی کو کافی سمجھ لیا ہے، اور اُن لوگوں کی غلط فہمیاں بھی جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ انسان کو اس کے اعمال کی پوری جزا تناسُخ کی صورت میں مل سکتی ہے۔ دراصل ان دونوں گروہوں نے نہ تو انسانی اعمال اور ان کے اثرات ونتائج کی وسعتوں کو سمجھا ہے اور نہ منصفانہ جزا اور اس کے تقاضوں کو۔ ایک انسان آج اپنی پچاس ساٹھ سال کی زندگی میں جو اچھے یا بُرے کام کرتا ہے ان کی ذمّہ داری میں نہ معلوم اُوپر کی کتنی نسلیں شریک ہیں جو گزر چکیں اور آج یہ ممکن نہیں کہ انھیں اس کی جزا یا سزا پہنچ سکے۔ پھر اس شخص کے یہ اچھے یا بُرے اعمال جو وہ آج کر رہا ہے اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جائیں گے، بلکہ ان کے اثرات کا سلسلہ آیندہ صدہا برس تک چلتا رہے گا، ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں تک پھیلے گا اور اس کے حساب کا کھاتہ اُس وقت تک کھلا رہے گا جب تک یہ اثرات چل رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ آج ہی اِس دُنیا کی زندگی میں اس شخص کو اس کے کسب کی پوری جزا مل جائے، درآں حالے کہ ابھی اس کے کسب کے اثرات کا لاکھواں حصّہ بھی رُونما نہیں ہوا ہے۔ پھر اس دنیا کی محدود زندگی اور اس کے محدود امکانات سرے سے اتنی گنجایش ہی نہیں رکھتے کہ یہاں کسی کو اس کے کسب کا پورا بدلہ مل سکے۔ آپ کسی ایسے شخص کے جرم کا تصور کیجیے جو مثلاً دنیا میں ایک جنگِ عظیم کی آگ بھڑکاتا ہے اور اس کی اس حرکت کے بے شمار بُرے نتائج ہزاروں برس تک اربوں انسانوں تک پھیلتے ہیں۔ کیا کوئی بڑی سے بڑی جسمانی، اخلاقی، روحانی، یا مادّی سزا بھی، جو اس دُنیا میں دی جانی ممکن ہے، اُس کے اِس جرم کی پوری منصفانہ سزا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح کیا دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انعام بھی، جس کا تصور آپ کر سکتے ہیں، کسی ایسے شخص کے لیے کافی ہو سکتا ہے جو مدّت العمر نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے کام کرتا رہا ہو اور ہزاروں سال تک بے شمار انسان جس کی سعی کے ثمرات سے فائدہ اُٹھائے چلے جا رہے ہوں؟ عمل اور جزا کے مسئلے کو اس پہلو سے جو شخص دیکھے گا، اُسے یقین ہو جائے گا کہ جزا کے لیے ایک دوسرا ہی عالَم درکار ہے جہاں تمام اگلی اور پچھلی نسلیں جمع ہوں، تمام انسانوں کے کھاتے بند ہو چکے ہوں، حساب کرنے کے لیے ایک

وَ قَالَتۡ اُوۡلٰىهُمۡ لِاُخۡرٰىهُمۡ فَمَا كَانَ لَـكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡسِبُوۡنَ ﴿۳۹﴾ ع

ع ۴ ۸

اور پہلا گروہ دُوسرے گروہ سے کہے گا کہ (اگر ہم قابلِ الزام تھے) تو تمھی کو ہم پر کون سی فضیلت حاصل تھی، اب اپنی کمائی کے نتیجے میں عذاب کا مزا چکھو۔[۳۱] ع

علیم وخبیر خدا انصاف کی کُرسی پر مُتمکّن ہو، اور اعمال کا پورا بدلہ پانے کے لیے انسان کے پاس غیر محدود زندگی اور اس کے گردوپیش جزا و سزا کے غیر محدود امکانات موجود ہوں۔

پھر اسی پہلو پر غور کرنے سے اہلِ تناسُخ کی ایک اور بنیادی غلطی کا ازالہ بھی ہوسکتا ہے، جس میں مبتلا ہو کر انھوں نے آواگَون کا چکّر تجویز کیا ہے۔ وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھے کہ صرف ایک ہی مختصر سی پچاس سالہ زندگی کے کارنامے کا پھل پانے کے لیے اُس سے ہزاروں گُنی زیادہ طویل زندگی درکار ہے، کجا کہ اس پچاس سالہ زندگی کے ختم ہوتے ہی ہماری ایک دوسری اور پھر تیسری ذمّہ دارانہ زندگی اِسی دُنیا میں شروع ہو جائے اور ان زندگیوں میں بھی ہم مزید ایسے کام کرتے چلے جائیں جن کا اچھا یا بُرا پھل ہمیں ملنا ضروری ہو۔ اِس طرح تو حساب بے باق ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھتا ہی چلا جائے گا اور اس کے بے باق ہونے کی نوبت کبھی آ ہی نہ سکے گی۔

۳۱- اہلِ دوزخ کی اس باہمی تکرار کو قرآنِ مجید میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ سبا، آیات ۳۱ - ۳۳ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "کاش! تم دیکھ سکو اُس موقع کو جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اور ایک دوسرے پر باتیں بنا رہے ہوں گے۔ جو لوگ دُنیا میں کمزور بنا کر رکھے گئے تھے وہ اُن لوگوں سے جو بڑے بن کر رہے تھے، کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ وہ بڑے بننے والے ان کمزور بنائے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روک دیا تھا جب کہ وہ تمھارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔" مطلب یہ ہے کہ تم خود کب ہدایت کے طالب تھے؟ اگر ہم نے تمھیں دُنیا کے لالچ دے کر اپنا بندہ بنایا تو تم لالچی تھے، جب ہی تو ہمارے دام میں گرفتار ہوئے۔ اگر ہم نے تمھیں خریدا تو تم خود بِکنے کے لیے تیار تھے جب ہی تو ہم خرید سکے۔ اگر ہم نے تمھیں مادّہ پرستی اور دُنیا پرستی اور قوم پرستی اور ایسی ہی دوسری گمراہیوں اور بداعمالیوں میں مبتلا کیا تو تم خود خدا سے بیزار اور دنیا کے پرستار تھے، جب ہی تو تم نے خدا پرستی کی طرف بُلانے والوں کو چھوڑ کر ہماری پکار پر لبیک کہا۔ اگر ہم نے تمھیں مذہبی قسم کے فریب دیے تو اُن چیزوں کی مانگ تو تمھارے ہی اندر موجود تھی جنھیں ہم پیش کرتے تھے اور تم لپک لپک کر لیتے تھے۔ تم خدا کے بجائے ایسے حاجت روا مانگتے تھے جو تم سے کسی اخلاقی قانون کی پابندی کا مطالبہ نہ کریں اور بس تمھارے کام بناتے رہیں۔ ہم نے وہ حاجت روا تمھیں گھڑ کر دے دیے۔ تم کو ایسے سفارشیوں کی تلاش تھی کہ تم خدا سے بے پروا ہو کر دُنیا کے کُتّے بنے رہو اور بخشوانے کا ذمّہ وہ لے لیں۔ ہم نے وہ سفارشی تصنیف کر کے تمھیں فراہم

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا عَنۡهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَـنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الۡجَمَلُ فِىۡ سَمِّ الۡخِيَاطِ‌ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمۡ مِّنۡ جَهَـنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنۡ فَوۡقِهِمۡ غَوَاشٍ‌ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۱﴾ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُـكَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَاۤ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ‌ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعۡنَا مَا فِىۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهِمُ الۡاَنۡهٰرُ‌ ۚ

یقین جانو، جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور ان کے مقابلے میں سرکشی کی ہے، ان کے لیے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے۔ اُن کا جنّت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سُوئی کے ناکے سے اُونٹ کا گزرنا۔ مجرموں کو ہمارے ہاں ایسا ہی بدلہ مِلا کرتا ہے۔ ان کے لیے تو جہنّم کا بچھونا ہوگا اور جہنم ہی کا اوڑھنا۔ یہ ہے وہ جزا جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا ہے اور اچھے کام کیے ہیں ـــ اور اس باب میں ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمّہ دار ٹھیراتے ہیں ـــ وہ اہلِ جنت ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے دلوں میں ایک دُوسرے کے خلاف جو کچھ کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے[۳۲]۔ اُن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی،

کر دیے۔ تم چاہتے تھے کہ خشک و بے مزا دین داری اور پرہیزگاری اور قربانی اور سعی و عمل کے بجائے نجات کا کوئی اور راستہ بتایا جائے جس میں نفس کے لیے لذتیں ہی لذتیں ہوں اور خواہشات پر پابندی کوئی نہ ہو۔ ہم نے ایسے خوش نما مذہب تمھارے لیے ایجاد کر دیے۔ غرض کہ ذمّہ داری تنہا ہمارے ہی اوپر نہیں ہے، تم بھی برابر کے ذمّہ دار ہو۔ ہم اگر گمراہی فراہم کرنے والے تھے تو تم اس کے خریدار تھے۔

۳۲ – یعنی دُنیا کی زندگی میں ان نیک لوگوں کے درمیان اگر کچھ رنجشیں، بدمزگیاں اور آپس کی غلط فہمیاں رہی

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور وہ کہیں گے کہ ”تعریف خدا ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا، ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا، ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول واقعی حق ہی لے کر آئے تھے۔“ اُس وقت نِدا آئے گی کہ ”یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو، تمھیں اُن اعمال کے بدلے میں ملی ہے جو تم کرتے رہے تھے۔“ [۳۳]

ہوں تو آخرت میں وہ سب دُور کر دی جائیں گی۔ ان کے دل ایک دوسرے سے صاف ہو جائیں گے۔ وہ مخلص دوستوں کی حیثیت سے جنت میں داخل ہوں گے۔ اُن میں سے کسی کو یہ دیکھ کر تکلیف نہ ہوگی کہ فُلاں جو میرا مخالف تھا اور فُلاں جو مجھ سے لڑا تھا اور فُلاں جس نے مجھ پر تنقید کی تھی، آج وہ بھی اس ضیافت میں میرے ساتھ شریک ہے۔ اسی آیت کو پڑھ کر حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ مجھے اُمید ہے کہ اللہ میرے اور عثمانؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ کے درمیان بھی صفائی کرا دے گا۔

اس آیت کو اگر ہم زیادہ وسیع نظر سے دیکھیں تو یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ صالح انسانوں کے دامن پر اس دُنیا کی زندگی میں جو داغ لگ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان داغوں سمیت انھیں جنت میں نہ لے جائے گا، بلکہ وہاں داخل کرنے سے پہلے اپنے فضل سے انھیں بالکل پاک صاف کر دے گا اور وہ بے داغ زندگی لیے ہوئے وہاں جائیں گے۔

۳۳ – یہ ایک نہایت لطیف معاملہ ہے جو وہاں پیش آئے گا۔ اہلِ جنت اس بات پر نہ پھولیں گے کہ ہم نے کام ہی ایسے کیے تھے جن پر ہمیں جنت ملنی چاہیے تھی، بلکہ وہ خدا کی حمد وثنا اور شکر واحسان مندی میں رَطبُ اللّسان ہوں گے اور کہیں گے کہ یہ سب ہمارے رب کا فضل ہے ورنہ ہم کس لائق تھے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ ان پر اپنا احسان نہ جتائے گا بلکہ جواب میں ارشاد فرمائے گا کہ تم نے یہ درجہ اپنی خدمات کے صلے میں پایا ہے، یہ تمھاری اپنی محنت کی کمائی ہے جو تمھیں دی جا رہی ہے، یہ بھیک کے ٹکڑے نہیں ہیں بلکہ تمھاری سعی کا اجر ہے، تمھارے کام کی مزدوری ہے، اور وہ باعزت روزی ہے جس کا استحقاق تم نے اپنی قوتِ بازو سے اپنے لیے حاصل کیا ہے۔ پھر یہ مضمون اِس اندازِ بیان سے اور بھی زیادہ لطیف ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جواب کا ذکر اس تصریح کے ساتھ نہیں فرماتا کہ ہم یوں کہیں گے، بلکہ انتہائی شانِ کریمی کے ساتھ فرماتا ہے کہ جواب میں یہ ندا آئے گی۔

درحقیقت یہی معاملہ دنیا میں بھی خدا اور اس کے نیک بندوں کے درمیان ہے۔ ظالموں کو جو نعمت دُنیا میں ملتی ہے وہ اس پر فخر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ ہماری قابلیّت اور سعی وکوشش کا نتیجہ ہے، اور اسی بنا پر وہ ہر نعمت کے حصول پر اور زیادہ

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ

وقف لازم
با تفاق

پھر یہ جنّت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے: ”ہم نے اُن سارے وعدوں کو ٹھیک پا لیا جو ہمارے رب نے ہم سے کیے تھے، کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمھارے رب نے کیے تھے؟“ وہ جواب دیں گے: ”ہاں“۔ تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ ”خدا کی لعنت اُن ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور آخرت کے منکر تھے۔“

ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہوگی جس کی بلندیوں (اَعراف) پر کچھ اَور لوگ ہوں گے۔ یہ ہر ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنّت والوں سے پکار کر کہیں گے

متکبر اور مفسد بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس صالحین کو جو نعمت بھی ملتی ہے وہ اسے خدا کا فضل سمجھتے ہیں، شکر بجا لاتے ہیں، جتنے نوازے جاتے ہیں اتنے ہی زیادہ مُتواضع اور رحیم و شفیق اور فیاض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر آخرت کے بارے میں بھی وہ اپنے حُسنِ عمل پر غرور نہیں کرتے کہ ہم تو یقیناً بخشے ہی جائیں گے، بلکہ اپنی کوتاہیوں پر اِستغفار کرتے ہیں، اپنے عمل کے بجائے خدا کے رحم اور فضل سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں اور ہمیشہ ڈرتے ہی رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے حساب میں لینے کے بجائے کچھ دینا ہی نہ نکل آئے۔ بخاری و مسلم دونوں میں رِوَایت موجود ہے کہ حضوؐر نے فرمایا: اعلموا ان احدکم لن یدخلہ عملہ الجنۃ۔ خوب جان لو کہ تم محض اپنے عمل کے بل بُوتے پر جنت میں نہ پہنچ جاؤ گے۔ لوگوں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! کیا آپ بھی؟ فرمایا: ہاں مَیں بھی، الا ان یتغمدنی اللہ برحمۃ منہ وفضل، اِلّا یہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت اور اپنے فضل سے ڈھانک لے۔

عَلَيۡكُمۡ ۟ لَمۡ يَدۡخُلُوۡهَا وَهُمۡ يَطۡمَعُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُهُمۡ تِلۡقَآءَ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوۡا رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۷﴾ وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا يَّعۡرِفُوۡنَهُمۡ بِسِيۡمٰىهُمۡ قَالُوۡا مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡكُمۡ جَمۡعُكُمۡ وَمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰٓؤُلَۤاءِ الَّذِيۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحۡمَةٍ ؕ اُدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡكُمۡ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۴۹﴾ وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ اَنۡ اَفِيۡضُوۡا عَلَيۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا

کہ "سلامتی ہو تم پر!" یہ لوگ جنت میں داخل تو نہیں ہوئے مگر اس کے امیدوار ہوں گے۔[۳۴] اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے: "اے رب ہمیں اِن ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو۔" ؏ پھر یہ اَعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ "دیکھ لیا تم نے، آج نہ تمھارے جتھے تمھارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز و سامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے۔ اور کیا یہ اہلِ جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلّق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ بھی نہ دے گا؟ آج انھی سے کہا گیا کہ داخل ہو جاؤ جنت میں، تمھارے لیے نہ خوف ہے نہ رنج۔"

اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہم پر ڈال دو یا جو رزق اللہ نے تمھیں دیا ہے اُسی میں سے کچھ پھینک دو۔ وہ جواب دیں گے کہ "اللہ نے یہ دونوں چیزیں اُن منکرینِ حق پر حرام

---

۳۴ – یعنی یہ اصحاب الاعراف وہ لوگ ہوں گے جن کی زندگی کا نہ تو مثبت پہلو ہی اتنا قوی ہو گا کہ جنت میں داخل ہو سکیں اور نہ منفی پہلو ہی اتنا خراب ہو گا کہ دوزخ میں جھونک دیے جائیں۔ اس لیے وہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک سرحد پر رہیں گے۔

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ

کر دی ہیں جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنا لیا تھا اور جنھیں دُنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اللہ فرماتا ہے کہ آج ہم بھی انھیں اسی طرح بُھلا دیں گے جس طرح وہ اِس دن کی ملاقات کو بُھولے رہے اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے۔[۳۵]''

ہم اِن لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر مفصّل بنایا[۳۶] ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔[۳۷] اب کیا یہ لوگ اِس کے سوا کسی اَور بات کے منتظر ہیں

۳۵- اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ اور اصحاب الاعراف کی اس گفتگو سے کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عالَمِ آخرت میں انسان کی قوتوں کا پیمانہ کس قدر وسیع ہو جائے گا۔ وہاں آنکھوں کی بینائی اتنے بڑے پیمانے پر ہوگی کہ جنت اور دوزخ اور اعراف کے لوگ جب چاہیں گے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے۔ وہاں آواز اور سماعت بھی اتنے بڑے پیمانے پر ہوگی کہ اِن مختلف دنیاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے بآسانی گُفت وشنید کرسکیں گے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے بیانات جو عالَمِ آخرت کے متعلق ہمیں قرآن میں ملتے ہیں، اِس بات کا تصور دلانے کے لیے کافی ہیں کہ وہاں زندگی کے قوانین ہماری موجودہ دُنیا کے قوانینِ طبیعی سے بالکل مختلف ہوں گے، اگرچہ ہماری شخصیتیں یہی رہیں گی جو یہاں ہیں۔ جن لوگوں کے دماغ اِس عالمِ طبیعی کے حدود میں اس قدر مقیّد ہیں کہ موجودہ زندگی اور اس کے مختصر پیمانوں سے وسیع تر کسی چیز کا تصور ان میں نہیں سما سکتا، وہ قرآن اور حدیث کے اِن بیانات کو بڑے اچنبھے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات ان کا مذاق اُڑا کر اپنی خفیف العقلی کا مزید ثبوت بھی دینے لگتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان بے چاروں کا دماغ جتنا تنگ ہے، زندگی کے امکانات اتنے تنگ نہیں ہیں۔

۳۶- یعنی اس میں پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور انسان کے لیے دُنیا کی زندگی میں کون سا رَویّہ دُرست ہے اور صحیح طرزِ زندگی کے بنیادی اُصول کیا ہیں۔ پھر یہ تفصیلات بھی قیاس یا گمان یا وہم کی بنیاد پر نہیں بلکہ خالص علم کی بنیاد پر ہیں۔

۳۷- مطلب یہ ہے کہ اوّل تو اس کتاب کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہی بجائے خود اس قدر صاف ہیں کہ آدمی

إِلَّا تَأْوِيلَهُ ۚ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَنَا مِنْ شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ قَدْ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۵۳﴾ ع

کہ وہ انجام سامنے آ جائے جس کی یہ کتاب خبر دے رہی ہے[۳۸]؟ جس روز وہ انجام سامنے آ گیا تو وہی لوگ جنھوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا، کہیں گے کہ "واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے، پھر کیا اب ہمیں کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں[۳۹]" ـــــ انھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور وہ سارے جھوٹ جو انھوں نے تصنیف کر رکھے تھے آج ان سے گم ہو گئے۔ ع

اگر ان پر غور کرے تو اس کے سامنے راہِ حق واضح ہو سکتی ہے۔ پھر اس پر مزید یہ ہے کہ جو لوگ اس کتاب کو مانتے ہیں، ان کی زندگی میں عملاً بھی اِس حقیقت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ انسان کی کیسی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس کا اثر قبول کرتے ہی انسان کی ذہنیت، اس کے اخلاق اور اس کی سیرت میں بہترین انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اشارہ ہے اُن حیرت انگیز اثرات کی طرف جو اس کتاب پر ایمان لانے سے صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں ظاہر ہو رہے تھے۔

۳۸- دوسرے الفاظ میں اس مضمون کو یوں سمجھیے کہ جس شخص کو صحیح اور غلط کا فرق نہایت معقول طریقے سے صاف صاف بتایا جاتا ہے مگر وہ نہیں مانتا، پھر اس کے سامنے کچھ لوگ صحیح راستے پر چل کر مشاہدہ بھی کرا دیتے ہیں کہ غلط رَوی کے زمانے میں وہ جیسے کچھ تھے اس کی بہ نسبت راست روی اختیار کر کے ان کی زندگی کتنی بہتر ہو گئی ہے، مگر اس سے بھی وہ کوئی سبق نہیں لیتا، تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اب وہ صرف اپنی غلط روی کی سزا پا کر ہی مانے گا کہ ہاں یہ غلط رَوی تھی۔ جو شخص نہ حکیم کے عاقلانہ مشوروں کو قبول کرتا ہے اور نہ اپنے جیسے بکثرت بیماروں کو حکیم کی ہدایات پر عمل کرنے کی وجہ سے شفایاب ہوتے دیکھ کر ہی کوئی سبق لیتا ہے، وہ اب بسترِ مرگ پر لیٹ جانے کے بعد ہی تسلیم کرے گا کہ جن طریقوں پر وہ زندگی بسر کر رہا تھا وہ اس کے لیے واقعی مہلک تھے۔

۳۹- یعنی وہ دوبارہ اِس دُنیا میں واپس آنے کی خواہش کریں گے اور کہیں گے کہ جس حقیقت کی ہمیں خبر دی گئی تھی اور اُس وقت ہم نے نہ مانا تھا، اب مشاہدہ کر لینے کے بعد ہم اس سے واقف ہو گئے ہیں، لہٰذا اگر ہمیں دُنیا میں پھر بھیج دیا جائے

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا

درحقیقت تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا[40]، پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا[41]۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے

تو ہمارا طرزِ عمل وہ نہ ہوگا جو پہلے تھا۔ اس درخواست اور اس کے جوابات کے لیے مُلاحظہ ہو: الانعام، آیت ۲۷-۲۸، ابراہیم ۴۴-۴۵، السجدہ ۱۲-۱۳، فاطر ۳۷، الزُّمر ۵۶ تا ۵۹، المومن ۱۱-۱۲۔

۴۰ – یہاں دن کا لفظ یا تو اسی چوبیس گھنٹے کے دن کا ہم معنٰی ہے جسے دُنیا کے لوگ دن کہتے ہیں، یا پھر یہ لفظ دَور (period) کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ حج، آیت ۴۷ میں فرمایا: وَ اِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (اور حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کے ہاں ایک دن ہزار سال کے برابر ہے اُس حساب سے جو تم لوگ لگاتے ہو)، اور سورۂ معارج کی آیت ۴ میں فرمایا کہ: تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ الرُّوۡحُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗ خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَۃٍ (فرشتے اور جبریلؑ اس کی طرف ایک دن میں چڑھتے ہیں جس کی مقدار ۵۰ ہزار سال کی ہے)۔ اس کا صحیح مفہوم اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حٰم السجدہ، حواشی ۱۱ تا ۱۵)

۴۱ – خدا کے اِستواء عَلَی العرش (تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہونے) کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کے بعد کسی مَقام کو اپنی اس لامحدود سلطنت کا مرکز قرار دے کر اپنی تجلیات کو وہاں مرتکز فرما دیا ہو اور اسی کا نام عرش ہو، جہاں سے سارے عالَم پر وجود اور قوت کا فیضان بھی ہو رہا ہے اور تدبیرِ امر بھی فرمائی جا رہی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرش سے مراد اقتدارِ فرماں روائی ہو اور اس پر جلوہ فرما ہونے سے مراد یہ ہو کہ اللہ نے کائنات کو پیدا کر کے اس کی زمامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ بہرحال اِستواء عَلَی العرش کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو، قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالقِ کائنات ہی نہیں ہے، بلکہ مدبّرِ کائنات بھی ہے۔ وہ دُنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر کہیں بیٹھ نہیں گیا ہے، بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جُزو وکُل پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ سلطانی وحکمرانی کے تمام اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں، ہر چیز اس کے امر کی تابع ہے، ذرّہ ذرّہ اس کے فرمان کا مطیع ہے اور موجودات کی قسمتیں دائماً اس کے حکم سے وابستہ ہیں۔ اس طرح قرآن اُس بنیادی غلط فہمی کی جڑ کاٹنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہُوا ہے اور کبھی خودمختاری و خودسری کی ضلالت میں۔ خدا کو کائنات کے انتظام سے عملاً بے تعلق سمجھ لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی قسمت کو دوسروں سے وابستہ سمجھے اور ان کے آگے سر جھکا دے، یا پھر اپنی قسمت کا مالک خود اپنے آپ کو سمجھے اور خودمختار بن بیٹھے۔

یہاں ایک بات اور قابلِ توجہ ہے۔ قرآنِ مجید میں خدا اور خَلق کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے انسانی زبان میں سے

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا

سُورج اور چاند اور تارے پیدا کیے۔سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔خبردار رہو! اُسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔[۴۲] بڑا بابرکت[۴۳] ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔اپنے رب کو پکارو، گڑگڑاتے ہوئے

زیادہ تر وہ الفاظ، مصطلحات، استعارے اور اندازِ بیان انتخاب کیے گئے ہیں جو سلطنت و بادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ طرزِ بیان قرآن میں اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی شخص جو سمجھ کر قرآن کو پڑھتا ہو، اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔بعض کم فہم ناقدین کے معکوس دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ کتاب جس عہد کی "تصنیف" ہے، اس زمانے میں انسان کے ذہن پر شاہی نظام کا تسلُّط تھا، اس لیے مصنف نے (جس سے مراد ان ظالموں کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) خدا کو بادشاہ کے رنگ میں پیش کیا۔حالانکہ دراصل قرآن جس دائمی و اَبَدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں پادشاہی صرف ایک ذات کی ہے، اور حاکمیت (sovereignity) جس شے کا نام ہے، وہ اسی ذات کے لیے خاص ہے، اور یہ نظامِ کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے جس میں تمام اختیارات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے، لہٰذا اس نظام میں جو شخص یا گروہ اپنی یا کسی اور کی جُزوی یا کُلّی حاکمیت کا مدعی ہے وہ محض فریب میں مبتلا ہے۔نیز یہ کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے انسان کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا رَوِیّہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اُسی ایک ذات کو مذہبی معنوں میں واحد معبُود بھی مانے اور سیاسی و تمدّنی معنوں میں واحد سلطان (sovereign) بھی تسلیم کرے۔

۴۲ — یہ اُسی مضمون کی مزید تشریح ہے جو "استواء علی العرش" کے الفاظ میں مُجملاً بیان کیا گیا تھا۔یعنی یہ کہ خدا محض خالق ہی نہیں، آمِر اور حاکم بھی ہے۔اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس میں حکم چلائیں، اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصّے کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح چاہے خود کام کرے۔ بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے۔لیل و نہار کی گردش آپ سے آپ نہیں ہو رہی ہے بلکہ خدا کے حکم سے ہو رہی ہے، جب چاہے اسے روک دے اور جب چاہے اس کے نظام کو تبدیل کر دے۔سورج اور چاند اور تارے خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں بالکل مسخّر ہیں اور مجبور غلاموں کی طرح بس وہی کام کیے جا رہے ہیں جو خدا ان سے لے رہا ہے۔

۴۳ — برکت کے اصل معنٰی ہیں نمو، افزایش اور بڑھوتری کے، اور اسی کے ساتھ اس لفظ میں رفعت و عظمت کا مفہوم بھی ہے اور ثبات اور جماؤ کا بھی۔پھر ان سب مفہومات کے ساتھ خیر اور بھلائی کا تصوُّر لازماً شامل ہے۔پس اللہ کے نہایت بابرکت ہونے کا مطلب یہ ہُوا کہ اس کی خوبیوں اور بھلائیوں کی کوئی حد نہیں ہے، بے حد و حساب خیرات اس کی ذات سے پھیل رہی ہیں، اور وہ بہت بلند و برتر ہستی ہے، کہیں جا کر اس کی بلندی ختم نہیں ہوتی، اور اس کی یہ بھلائی اور رفعت مستقل ہے، عارضی نہیں ہے کہ کبھی اس کو زوال ہو۔(مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الفرقان، حواشی ۱-۱۹)

وَّ خُفۡیَۃً ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿ۚ۵۵﴾ وَ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِہَا وَ ادۡعُوۡہُ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰہِ

اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے[۴۴] اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ،[۴۵] یقیناً اللہ کی رحمت

۴۴- ''زمین میں فساد برپا نہ کرو''، یعنی زمین کے انتظام کو خراب نہ کرو۔ انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا، اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت اور تمدّن کو ایسے اُصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار صورتیں رُونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔ پھر اس کے ساتھ قرآن اس حقیقت پر بھی مُتنبِّہ کرتا ہے کہ زمین کے انتظام میں اصل چیز فساد نہیں ہے جس پر صلاح عارض ہوئی ہو، بلکہ اصل چیز صلاح ہے جس پر فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی سے عارض ہوتا رہا ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہاں انسان کی زندگی کی ابتدا جہالت و وحشت اور شرک و بغاوت اور اخلاقی بدنظمی سے نہیں ہوئی ہے، جس کو دُور کرنے کے لیے بعد میں بتدریج اصلاحات کی گئی ہوں، بلکہ فی الحقیقت انسانی زندگی کا آغاز صلاح سے ہوا ہے اور بعد میں اس دُرست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے خراب کرتے رہے ہیں۔ اسی فساد کو مٹانے اور نظامِ حیات کو ازسرِ نو درست کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبرؑ بھیجتا رہا ہے، اور انھوں نے ہر زمانے میں انسان کو یہی دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس صلاح پر قائم کیا گیا تھا اس میں فساد برپا کرنے سے باز آؤ۔

اس معاملے میں قرآن کا نقطۂ نظر اُن لوگوں کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے جنھوں نے ارتقا کا ایک غلط تصور لے کر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بنی اور بنتی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر بسایا تھا اور ایک صالح نظام سے اس کی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ پھر انسان خود شیطانی رہنمائی قبول کر کے بار بار تاریکی میں جاتا رہا اور اس صالح نظام کو بگاڑتا رہا، اور خدا بار بار اپنے پیغمبروںؑ کو اس غرض کے لیے بھیجتا رہا کہ اسے تاریکی سے روشنی کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے کی دعوت دیں۔ (سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۳۰)

۴۵- اس فقرے سے واضح ہو گیا کہ اُوپر کے فقرے میں جس چیز کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ دراصل یہی ہے کہ انسان خدا کے بجائے کسی اور کو اپنا ولی و سرپرست اور کارساز اور کارفرما قرار دے کر مدد کے لیے پکارے۔ اور اصلاح اس کے سوا کسی دوسری چیز کا نام نہیں ہے کہ انسان کی اِس پکار کا مَرجَع پھر سے محض اللہ کی ذات ہی ہو جائے۔

خوف اور طمع کے ساتھ پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں خوف بھی ہو تو اللہ سے ہو، اور تمھاری اُمیدیں بھی اگر کسی سے

قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿٥٨﴾ ع

نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوش خبری لیے ہوئے بھیجتا ہے، پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اُٹھا لیتی ہیں تو انھیں کسی مُردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر (اُسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو، اس طرح ہم مُردوں کو حالتِ موت سے نکالتے ہیں، شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا[۴۶]۔ اس طرح ہم نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو شکر گزار ہونے والے ہیں ؏

وابستہ ہوں تو صرف اللہ سے ہوں۔ اللہ کو پکارو تو اس احساس کے ساتھ پکارو کہ تمھاری قسمت بالکلیّہ اس کی نظرِ عنایت پر منحصر ہے، فلاح و سعادت کو پہنچ سکتے ہو تو صرف اس کی مدد اور رہنمائی سے، ورنہ جہاں تم اس کی اعانت سے محروم ہوئے، پھر تمھارے لیے تباہی و نامرادی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں ہے۔

۴۶ – یہاں ایک لطیف مضمون ارشاد ہوا ہے جس پر مُتنبِّہ ہو جانا اصل مُدّعا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ بارش اور اس کی برکتوں کے ذکر سے اِس مقام پر خدا کی قدرت کا بیان اور حیات بعد الممات کا اثبات بھی مقصود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تمثیل کے پیرایے میں رسالت اور اس کی برکتوں کا اور اس کے ذریعے سے خوب و زِشت میں فرق اور خبیث و طیّب میں امتیاز

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖ فَقَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ

ہم نے نُوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا[۴۷]۔ اس نے کہا: ”اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو،

نمایاں ہو جانے کا نقشہ دکھانا بھی پیشِ نظر ہے۔ رسول کی آمد اور خدائی تعلیم و ہدایت کے نُزول کو بارانی ہواؤں کے چلنے اور ابرِ رحمت کے چھا جانے اور اَمرت بھری بوندوں کے برسنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پھر بارش کے ذریعے سے مردہ پڑی ہوئی زمین کے یکا یک جی اُٹھنے اور اس کے بطن سے زندگی کے خزانے اُبل پڑنے کو اُس حالت کے لیے بطورِ مثال پیش کیا گیا ہے جو نبی کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی سے مردہ پڑی ہوئی انسانیت کے یکا یک جاگ اُٹھنے اور اس کے سینے سے بھلائیوں کے خزانے اُبل پڑنے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح بارش کے نزول سے یہ ساری برکتیں صرف اسی زمین کو حاصل ہوتی ہیں جو حقیقت میں زرخیز ہوتی ہے اور محض پانی نہ ملنے کی وجہ سے جس کی صلاحیتیں دبی رہتی ہیں، اسی طرح رسالت کی ان برکتوں سے بھی صرف وہی انسان فائدہ اُٹھاتے ہیں جو حقیقت میں صالح ہوتے ہیں اور جن کی صلاحیتوں کو محض رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے نمایاں ہونے اور برسرِ کار آنے کا موقع نہیں ملتا۔ رہے شرارت پسند اور خبیث انسان، تو جس طرح شوریلی زمین بارانِ رحمت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتی بلکہ پانی پڑتے ہی اپنے پیٹ کے چھپے ہوئے زہر کو کانٹوں اور جھاڑیوں کی صورت میں اُگل دیتی ہے، اسی طرح رسالت کے ظُہور سے انھیں بھی کوئی نفع نہیں پہنچتا بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر دبی ہوئی تمام خباثتیں اُبھر کر پوری طرح برسرِ کار آجاتی ہیں۔

اسی تمثیل کو بعد کے کئی رُکوعوں میں مسلسل تاریخی شواہد پیش کر کے واضح کیا گیا ہے کہ ہر زمانے میں نبی کی بِعثت کے بعد انسانیت دو حصّوں میں تقسیم ہوتی رہی ہے۔ ایک طیّب حصّہ جو فیضِ رسالت سے پھلا اور پھولا اور بہتر برگ و بار لایا۔ دوسرا خبیث حصّہ جس نے کَسوٹی کے سامنے آتے ہی اپنی ساری کھوٹ نمایاں کر کے رکھ دی اور آخرِ کار اس کو ٹھیک اسی طرح چھانٹ کر پھینک دیا گیا جس طرح سُنار چاندی سونے کے کھوٹ کو چھانٹ پھینکتا ہے۔

۴۷ – اس تاریخی بیان کی ابتدا حضرت نوحؑ اور ان کی قوم سے کی گئی ہے، کیونکہ قرآن کی رُو سے جس صالح نظامِ زندگی پر حضرت آدمؑ اپنی اولاد کو چھوڑ گئے تھے اس میں سب سے پہلا بگاڑ حضرت نوحؑ کے دَور میں رونما ہوا اور اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور فرمایا۔

قرآن کے اشارات اور بائبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم اُس سرزمین میں رہتی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔ بابِل کے آثارِ قدیمہ میں بائبل سے قدیم تر جو کُتبات ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اُن میں تقریباً اسی قسم کا ایک قصّہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور توراۃ میں بیان ہوا ہے اور اس کی جائے وقوع مَوصِل کے نواح میں بتائی گئی ہے۔ پھر جو روایات کُردستان اور آرمینیا میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بعد نسلٍ چلی آ رہی ہیں، اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوحؑ کی کشتی اسی علاقے میں کسی مقام پر ٹھیری تھی۔ مَوصِل کے شمال میں جزیرۂ ابنِ عمر کے

مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ

اُس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں[48] ہے۔ میں تمھارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔ اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا: "ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو"۔ نوحؑ نے

آس پاس، آرمینیا کی سرحد پر کوہِ ارارات کے نواح میں نوح علیہ السلام کے مختلف آثار کی نشان دہی اب بھی کی جاتی ہے، اور شہر نخچیوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اِس شہر کی بِنا حضرت نوحؑ نے ڈالی تھی۔

حضرت نوحؑ کے اس قصّے سے مِلتی جُلتی رِوایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں اور اس کے علاوہ بَرما، مَلایا، جزائرِ شرق الہند، آسٹریلیا، نیوگنی اور امریکا و یورپ کے مختلف حصّوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصّہ اُس عہد سے تعلق رکھتا ہے جب کہ پوری نسلِ آدم کسی ایک ہی خطۂ زمین میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصّوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشان دہی کرتی ہیں، اگرچہ مُرورِ ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انھوں نے فراموش کر دیں اور اصل واقعے پر ہر ایک نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق افسانوں کا ایک بھاری خول چڑھا دیا۔

۴۸ – یہاں اور دوسرے مَقامات پر حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا جو حال قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو اللہ کے وجود کی منکر تھی، نہ اس سے ناواقف تھی، نہ اُسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا، بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہوگئی تھی، شرک کی گمراہی تھی۔ یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو خدائی میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصّہ دار قرار دے لیا تھا۔ پھر اس بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں رونما ہوگئیں۔ جو خود ساختہ معبُود خدائی میں شریک ٹھیرا لیے گئے تھے، ان کی نمایندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو تمام مذہبی، سیاسی اور مَعاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا اور اس نے انسانوں میں اُونچ اور نیچ کی تقسیم پیدا کر دی، اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فسق و فُجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس حالت کو بدلنے کے لیے ایک زمانۂ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ کوشش کی مگر عامۃ الناس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھانس رکھا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ آخرِ کار حضرت نوح علیہ السلام نے خدا سے دعا کی کہ ان کافروں میں سے ایک کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ، کیوں کہ اگر تُو نے ان میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا، بدکار اور نمک حرام ہی پیدا ہوگا۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ ہود، رکوع ۳۔ سورۂ شُعَراء، رکوع ۶۔ اور سورۂ نوح مکمّل)

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦١﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٦٣﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ

کہا: ”اے برادرانِ قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں ربّ العالمین کا رسول ہوں، تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمھارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجّب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمھارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمھیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے؟[۴۹]“ مگر انھوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور اُن لوگوں کو ڈبو دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا[۵۰] تھا، یقیناً

۴۹ — یہ معاملہ جو حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے درمیان پیش آیا تھا، بعینہٖ ایسا ہی معاملہ مکّے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی قوم کے درمیان پیش آ رہا تھا۔ جو پیغام حضرت نوحؑ کا تھا، وہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ جو شبہات اہلِ مکہ کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں ظاہر کرتے تھے، وہی شبہات ہزاروں سال پہلے سردارانِ قومِ نوحؑ نے حضرت نوحؑ کی رسالت میں ظاہر کیے تھے۔ پھر ان کے جواب میں جو باتیں حضرت نوحؑ کہتے تھے، بعینہٖ وہی باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے تھے۔ آگے چل کر دوسرے انبیا علیہم السلام اور ان کی قوموں کے جو قصّے مسلسل بیان ہو رہے ہیں، ان میں بھی یہی دکھایا گیا ہے کہ ہر نبی کی قوم کا رویّہ اہلِ مکّہ کے رویّے سے اور ہر نبی کی تقریر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے ہُوبہُو مشابہ ہے۔ اس سے قرآن اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ انسان کی گمراہی ہر زمانے میں بنیادی طور پر ایک ہی طرح کی رہی ہے، اور خدا کے بھیجے ہوئے معلّموں کی دعوت بھی ہر عہد اور ہر سرزمین میں یکساں رہی ہے۔ اور ٹھیک اسی طرح اُن لوگوں کا انجام بھی ایک ہی جیسا ہُوا ہے اور ہوگا جنھوں نے انبیا کی دعوت سے منہ موڑا اور اپنی گمراہی پر اصرار کیا۔

۵۰ — جو لوگ قرآن کے اندازِ بیان سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے وہ بسا اوقات اس شُبہے میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ سارا معاملہ بس ایک دو صحبتوں میں ختم ہو گیا ہو گا۔ نبی اُٹھا اور اس نے اپنا دعویٰ پیش کیا، لوگوں نے اعتراضات کیے

اور نبی نے ان کا جواب دیا، لوگوں نے جھٹلایا اور اللہ نے عذاب بھیج دیا۔ حالانکہ فی الحقیقت جن واقعات کو یہاں سمیٹ کر چند سطروں میں بیان کر دیا گیا ہے، وہ ایک نہایت طویل مدّت میں پیش آئے تھے۔ قرآن کا یہ مخصوص طرزِ بیان ہے کہ وہ قصّہ گوئی محض قصہ گوئی کی خاطر نہیں کرتا بلکہ سبق آموزی کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے ہر جگہ تاریخی واقعات کے بیان میں وہ قصّے کے صرف اُن اہم اجزا کو پیش کرتا ہے جو اس کے مقصد و مدعا سے کوئی تعلق رکھتے ہیں، باقی تمام تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ پھر اگر کسی قصے کو مختلف مواقع پر مختلف اغراض کے لیے بیان کرتا ہے تو ہر جگہ مقصد کی مناسبت سے تفصیلات بھی مختلف طور پر پیش کرتا ہے۔ مثلاً اِسی قصۂ نوحؑ کو لیجیے۔ یہاں اس کے بیان کا مقصد یہ بتانا ہے کہ پیغمبر کی دعوت کو جھٹلانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ پیغمبر کتنی طویل مدت تک اپنی قوم کو دعوت دیتا رہا۔ لیکن جہاں یہ قصہ اس غرض کے لیے بیان ہُوا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو صبر کی تلقین کی جائے وہاں خاص طور پر دعوتِ نوح علیہ السلام کی طویل مدّت کا ذکر کیا گیا ہے، تاکہ آں حضرتؐ اور آپؐ کے رفقا اپنی چند سال کی تبلیغی سعی و محنت کو نتیجہ خیز ہوتے نہ دیکھ کر بد دل نہ ہوں اور حضرت نوحؑ کے صبر کو دیکھیں جنھوں نے مدت ہائے دراز تک نہایت دل شکن حالات میں دعوتِ حق کی خدمت انجام دی اور ذرا ہمت نہ ہاری۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ عنکبوت، آیت ۱۴)

اس موقع پر ایک اور شک بھی لوگوں کے دلوں میں کھٹکتا ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے۔ جب ایک شخص قرآن میں بار بار ایسے واقعات پڑھتا ہے کہ فُلاں قوم نے نبی کو جھٹلایا اور نبی نے اسے عذاب کی خبر دی اور اچانک اس پر عذاب آیا اور قوم تباہ ہوگئی، تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس قسم کے واقعات اب کیوں نہیں پیش آتے؟ اگرچہ قومیں گرتی بھی ہیں اور اُبھرتی بھی ہیں، لیکن اس عُروج و زوال کی نوعیّت دوسری ہوتی ہے۔ یہ تو نہیں ہوتا کہ ایک نوٹس کے بعد زلزلہ یا طوفان یا صاعقہ آئے اور قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھ دے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فی الحقیقت اخلاقی اور قانونی اعتبار سے اُس قوم کا معاملہ جو کسی نبی کی براہِ راست مخاطَب ہو، دوسری تمام قوموں کے معاملے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جس قوم میں نبی پیدا ہوا ہو اور وہ بلاواسطہ اس کو خود اسی کی زبان میں خدا کا پیغام پہنچائے اور اپنی شخصیت کے اندر اپنی صداقت کا زندہ نمونہ اس کے سامنے پیش کر دے، اس پر خدا کی حجت پوری ہو جاتی ہے، اس کے لیے معذرت کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی، اور خدا کے فرستادہ کو دُوبدُو جھٹلا دینے کے بعد وہ اِس کی مستحق ہو جاتی ہے کہ اس کا فیصلہ برسرِ موقع چُکا دیا جائے۔ یہ نوعیتِ معاملہ اُن قوموں کے معاملے سے بنیادی طور پر مختلف ہے جن کے پاس خدا کا پیغام براہِ راست نہ آیا ہو بلکہ مختلف واسطوں سے پہنچا ہو۔ پس اگر اب اس طرح کے واقعات پیش نہیں آتے جیسے انبیا علیہم السلام کے زمانے میں پیش آئے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ البتہ تعجب کے قابل کوئی بات ہو سکتی تھی تو یہ کہ اب بھی کسی قوم پر اُسی شان کا عذاب آتا جیسا انبیاؑ کو دُوبدُو جھٹلانے والی قوموں پر آتا تھا۔

مگر اس کے یہ معنیٰ بھی نہیں ہیں کہ اب اُن قوموں پر عذاب آنے بند ہو گئے ہیں جو خدا سے برگشتہ اور فکری و اخلاقی گمراہیوں میں سرگشتہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی ایسی تمام قوموں پر عذاب آتے رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے تنبیہی عذاب بھی اور بڑے بڑے فیصلہ کُن عذاب بھی۔ لیکن کوئی نہیں جو انبیا علیہم السلام اور کُتبِ آسمانی کی طرح ان عذابوں کے اخلاقی

ع ۸ / ۱۵

كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾

وہ اندھے لوگ تھے۔ ع

اور عاد[۵۱] کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟"

معنیٰ کی طرف انسان کو توجہ دلائے۔ بلکہ اس کے برعکس ظاہر بیں سائنس دانوں اور حقیقت سے ناواقف مؤرّخین وفلاسفہ کا ایک کثیر گروہ نوعِ انسانی پر مسلّط ہے جو اس قسم کے تمام واقعات کی توجیہ طبعیاتی قوانین یا تاریخی اسباب سے کر کے اس کو بھُلاوے میں ڈالتا رہتا ہے اور اسے کبھی یہ سمجھنے کا موقع نہیں دیتا کہ اوپر کوئی خدا بھی موجود ہے جو غلط کار قوموں کو پہلے مختلف طریقوں سے ان کی غلط کاری پر مُتنبّہ کرتا ہے اور جب وہ اس کی بھیجی ہوئی تنبیہات سے آنکھیں بند کر کے اپنی غلطی روی پر اصرار کیے چلی جاتی ہیں تو آخرِ کار انھیں تباہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔

۵۱ – یہ عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے افسانے اہلِ عرب میں زبان زدِ عام تھے۔ بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ ان کی شوکت و حشمت ضربُ المَثَل تھی۔ پھر دنیا سے ان کا نام و نشان تک مٹ جانا بھی ضربُ المَثَل ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی شہرت کی وجہ سے عَرَبی زبان میں ہر قدیم چیز کے لیے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کو عادیّات کہتے ہیں۔ جس زمین کے مالک باقی نہ رہے ہوں اور جو آباد کار نہ ہونے کی وجہ سے اُفتادہ پڑی ہوئی ہو، اُسے عادیُّ الارض کہا جاتا ہے۔ قدیم عربی شاعری میں ہم کو بڑی کثرت سے اس قوم کا ذکر ملتا ہے۔ عرب کے ماہرینِ انساب بھی اپنے مُلک کی معدوم شدہ قوموں میں سب سے پہلے اسی قوم کا نام لیتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بنی ذُہل بن شَیبان کے ایک صاحب آئے جو عاد کے علاقے کے رہنے والے تھے اور انھوں نے وہ قصّے حضورؐ کو سنائے جو اس قوم کے متعلق قدیم زمانوں سے ان کے علاقے کے لوگوں میں نقل ہوتے چلے آ رہے تھے۔

قرآن کی رُو سے اس قوم کا اصل مَسکَن اَحقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان الرَّبعُ الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہیں سے پھیل کر ان لوگوں نے یمن کے مغربی سواحل اور عُمّان و حَضرَموت سے عراق تک اپنی طاقت کا سکّہ رواں کر دیا تھا۔ تاریخی حیثیت سے اس قوم کے آثار دنیا سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں، لیکن جنوبی عرب میں کہیں کہیں کچھ پرانے کھنڈر موجود ہیں جنھیں عاد کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ حَضرَموت میں ایک مقام پر حضرت ہودؑ کی قبر بھی مشہور ہے۔ ۱۸۳۷ء میں ایک انگریزی بحری افسر (James R. Wellested) کو حِصنِ غُراب میں ایک پُرانا کتبہ ملا تھا جس میں حضرت ہودؑ کا ذکر موجود ہے اور عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی تحریر ہے جو شریعتِ ہُود کے پیرو تھے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحَظہ ہو: الاحقاف، حاشیہ ۲۵)

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ یَعْبُدُ

اس کی قوم کے سرداروں نے ، جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے، جواب میں کہا: ”ہم تو تمھیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھُوٹے ہو۔“ اس نے کہا: ”اے برادرانِ قوم! میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں ربّ العالمین کا رسول ہوں، تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، اور تمھارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجّب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمھارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ وہ تمھیں خبردار کرے؟ بھُول نہ جاؤ کہ تمھارے رب نے نوحؑ کی قوم کے بعد تم کو اُس کا جانشین بنایا اور تمھیں خوب تنومند کیا، پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو،[۵۲] اُمّید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔“ انھوں نے جواب دیا: ”کیا تُو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور اُنھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا

---

۵۲ – اصل میں لفظ آلاء استعمال ہُوا ہے، جس کے معنیٰ نعمتوں کے بھی ہیں، اور کرشمہ ہائے قدرت کے بھی، اور صفاتِ حمیدہ کے بھی۔ آیت کا پورا مطلب یہ ہے کہ خدا کی نعمتوں اور اس کے احسانات کو بھی یاد رکھو اور یہ بھی فراموش نہ کرو کہ وہ تم سے یہ نعمتیں چھین لینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷۰ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ

کرتے آئے ہیں[۵۳]؟ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تُو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تُو سچّا ہے۔" اس نے کہا: "تمھارے رب کی پھٹکار تم پر پڑگئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا۔ کیا تم مجھ سے اُن ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں[۵۴]، جن کے لیے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے[۵۵]؟ اچھا تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمھارے ساتھ

۵۳ – یہاں یہ بات پھر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ قوم بھی اللہ سے منکر یا ناواقف نہ تھی اور نہ اُسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا۔ دراصل وہ حضرت ہودؑ کی جس بات کو ماننے سے انکار کرتی تھی، وہ صرف یہ تھی کہ اکیلے اللہ کی بندگی کی جائے، کسی دوسرے کی بندگی اس کے ساتھ شامل نہ کی جائے۔

۵۴ – یعنی تم کسی کو بارش کا، اور کسی کو ہوا کا، اور کسی کو دولت کا، اور کسی کو بیماری کا رب کہتے ہو، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی فی الحقیقت کسی چیز کا رب نہیں ہے۔ اس کی مثالیں موجودہ زمانے میں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ کسی انسان کو لوگ مشکل کُشا کہتے ہیں، حالانکہ مشکل کُشائی کی کوئی طاقت اس کے پاس نہیں ہے۔ کسی کو گنج بخش کے نام سے پکارتے ہیں، حالانکہ اس کے پاس کوئی گنج نہیں کہ کسی کو بخشے۔ کسی کے لیے داتا کا لفظ بولتے ہیں، حالانکہ وہ کسی شے کا مالک ہی نہیں کہ داتا بن سکے۔ کسی کو غریب نواز کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے، حالانکہ وہ غریب اُس اقتدار میں کوئی حصّہ نہیں رکھتا جس کی بنا پر وہ کسی غریب کو نواز سکے۔ کسی کو غوث (فریادرس) کہا جاتا ہے، حالانکہ وہ کوئی زور نہیں رکھتا کہ کسی کی فریاد کو پہنچ سکے۔ پس درحقیقت ایسے سب نام محض نام ہی ہیں جن کے پیچھے کوئی مسمّیٰ نہیں ہے۔ جو ان کے لیے جھگڑتا ہے وہ دراصل چند ناموں کے لیے جھگڑتا ہے، نہ کہ کسی حقیقت کے لیے۔

۵۵ – یعنی اللہ جس کو تم خود بھی ربِّ اکبر کہتے ہو، اس نے کوئی سند تمھارے اِن بناوٹی خداؤں کی الٰہیّت و رُبوبیّت کے حق میں عطا نہیں کی ہے۔ اس نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ میں نے فلاں فلاں کی طرف اپنی خدائی کا اتنا حصّہ منتقل کر دیا ہے۔ کوئی پروانہ اس نے کسی کو مشکل کُشائی یا گنج بخشی کا نہیں دیا۔ تم نے آپ ہی اپنے وہم وگمان سے اس کی خدائی کا جتنا حصّہ جس کو چاہا ہے، دے ڈالا ہے۔

الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾ ع وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ

ع ۹ ۸ ۱۶

وقف لازم

انتظار کرتا ہوں۔" آخر کار ہم نے اپنی مہربانی سے ہُودؑ اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور اُن لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے۔[۵۶] ع

اور ثمود[۵۷] کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی

۵۶ – جڑ کاٹ دی، یعنی ان کا اِستیصال کر دیا اور ان کا نام ونشان تک دنیا میں باقی نہ چھوڑا۔ یہ بات خود اہلِ عرب کی تاریخی رِوایات سے بھی ثابت ہے، اور موجودہ اثری اِکتشافات بھی اس پر شہادت دیتے ہیں کہ عادِ اُولیٰ بالکل تباہ ہو گئے اور ان کی یادگاریں تک دنیا سے مٹ گئیں۔ چنانچہ مؤرخینِ عرب انھیں عرب کی اُمَمِ بائدہ (معدوم اقوام) میں شمار کرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی عرب کے تاریخی مُسلّمات میں سے ہے کہ عاد کا صرف وہ حصّہ باقی رہا جو حضرت ہودؑ کا پیرو تھا۔ اِنھی بقایائے عاد کا نام تاریخ میں عادِ ثانیہ ہے، اور حِصنِ غُراب کا وہ کتبہ جس کا ہم ابھی ابھی ذکر کر چکے ہیں، انھی کی یادگاروں میں سے ہے۔ اس کتبے میں (جسے تقریباً ۱۸ سو برس قبلِ مسیح کی تحریر سمجھا جاتا ہے) ماہرینِ آثار نے جو عبارت پڑھی ہے، اس کے چند جملے یہ ہیں:

> "ہم نے ایک طویل زمانہ اس قلعے میں اس شان سے گزارا ہے کہ ہماری زندگی تنگی و بدحالی سے دُور تھی، ہماری نہریں دریا کے پانی سے لبریز رہتی تھیں.......... اور ہمارے حکمران ایسے بادشاہ تھے جو بُرے خیالات سے پاک اور اہلِ شر و فساد پر سخت تھے، وہ ہم پر ہودؑ کی شریعت کے مطابق حُکومت کرتے تھے، اور عمدہ فیصلے ایک کتاب میں درج کر لیے جاتے تھے، اور ہم معجزات اور موت کے بعد دوبارہ اُٹھائے جانے پر ایمان رکھتے تھے۔"

یہ عبارت آج بھی قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ عاد کی قدیم عظمت و شوکت اور خوش حالی کے وارث آخرِ کار وہی لوگ ہوئے جو حضرت ہودؑ پر ایمان لائے تھے۔

۵۷ – یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے اس کے قصے اہلِ عرب میں زبان زدِ عام تھے۔ زمانۂ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت اس کا ذکر ملتا ہے۔ اَسیریا کے کُتبات اور یونان، اسکندریہ اور روم کے قدیم مؤرخین اور جغرافیہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مسیحؑ کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے، چنانچہ رومی مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں

بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ

کھُلی دلیل آ گئی ہے۔ یہ اللہ کی اُونٹنی تمھارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے،[58] لہٰذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی

کے خلاف لڑے جن سے ان کی دشمنی تھی۔

اس قوم کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی اَلْحِجْر کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانے میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جسے مدائنِ صالح کہتے ہیں۔ یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانے میں حِجْر کہلاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا، اور اس شہرِ خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ نُزولِ قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثارِ قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے موقع پر جب ادھر سے گزرے تو آپؐ نے مسلمانوں کو یہ آثارِ عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آثارِ قدیمہ سے ہر صاحبِ بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک جگہ آپؐ نے ایک کنویں کی نشان دہی کر کے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالحؑ کی اُونٹنی پانی پیتی تھی، اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنویں سے پانی لینا، باقی کنوؤں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی دَرّے کو دکھا کر آپؐ نے بتایا کہ اسی دَرّے سے وہ اُونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ چنانچہ وہ مقام آج بھی فجّ الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے کھنڈروں میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے، اُن کو آپؐ نے جمع کیا اور ان کے سامنے ایک خطبہ دیا، جس میں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا، لہٰذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ، یہ سیر گاہ نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے۔

۵۸ – ظاہر عبارت سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے فقرے میں اللہ کی جس کھُلی دلیل کا ذکر فرمایا گیا ہے اس سے مراد یہی اُونٹنی ہے جسے اس دوسرے فقرے میں ’’نشانی‘‘ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ شعراء، آیات ۱۵۴ تا ۱۵۸ میں تصریح ہے کہ ثمود والوں نے خود ایک ایسی نشانی کا حضرت صالحؑ سے مطالبہ کیا تھا جو ان کے مامور من اللہ ہونے پر کھلی دلیل ہو، اور اسی کے جواب میں حضرت صالحؑ نے اُونٹنی کو پیش کیا تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اُونٹنی کا ظہور معجزے کے طور پر ہُوا تھا اور یہ اسی نوعیت کے معجزات میں سے تھا جو بعض انبیاءؑ نے اپنی نبوت کے ثبوت میں منکرین کے مطالبے پر پیش کیے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اس اُونٹنی کی معجزانہ پیدایش پر دلیل ہے کہ حضرت صالحؑ نے اسے پیش کر کے منکرین کو دھمکی دی کہ بس اب اس اُونٹنی کی جان کے ساتھ تمھاری زندگی معلّق ہے۔ یہ آزادانہ تمھاری زمینوں میں چرتی پھرے گی۔ ایک دن یہ اکیلی پانی پیے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پییں گے۔ اور اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جا سکتی تھی جس کا غیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ پھر یہ بات کہ ایک کافی مدّت تک یہ لوگ اس کے آزادانہ چرتے پھرنے کو اور اس بات کو کہ ایک دن تنہا وہ پانی پیے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پییں، بادلِ ناخواستہ برداشت کرتے رہے اور آخر بڑے مشوروں اور سازشوں کے بعد انھوں نے اسے قتل کیا، درآں حالے کہ حضرت صالحؑ کے پاس کوئی طاقت نہ تھی

فِیْٓ اَرْضِ اللّٰہِ وَلَا تَمَسُّوْھَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَکُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾ وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَکُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُھُوْلِھَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا ۚ فَاذْکُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰہِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِہٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا

زمین میں چرتی پھرے۔ اس کو کسی بُرے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا، ورنہ ایک دردناک عذاب تمھیں آ لے گا۔ یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قومِ عاد کے بعد تمھیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اُس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔[۵۹] پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔[۶۰]"

اُس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقے کے اُن لوگوں سے

جس کا انھیں کوئی خوف ہوتا، اِس حقیقت پر مزید دلیل ہے کہ وہ لوگ اس اُونٹنی سے خوف زدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی زور ہے جس کے بل پر وہ ہمارے درمیان دندناتی پھرتی ہے۔ مگر قرآن اس امر کی کوئی تصریح نہیں کرتا کہ یہ اُونٹنی کیسی تھی اور کس طرح وجود میں آئی۔ کسی حدیثِ صحیح میں بھی اس کے معجزے کے طور پر پیدا ہونے کی کیفیّت بیان نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے اُن روایات کو تسلیم کرنا کچھ ضروری نہیں جو مفسّرین نے اس کی کیفیّتِ پیدائش کے متعلق نقل کی ہیں۔ لیکن یہ بات کہ وہ کسی نہ کسی طور پر معجزے کی حیثیت رکھتی تھی، قرآن سے ثابت ہے۔

۵۹ – ثمود کی یہ صنعت ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان میں ایلورا، ایجنٹا اور بعض دوسرے مقامات پر پائی جاتی ہے، یعنی وہ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بناتے تھے، جیسا کہ اُوپر بیان ہُوا۔ مدائنِ صالح میں اب تک ان کی کچھ عمارتیں جُوں کی تُوں موجود ہیں اور ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم نے انجینیری میں کتنی حیرت انگیز ترقی کی تھی۔

۶۰ – یعنی عاد کے انجام سے سبق لو۔ جس خدا کی قدرت نے اُس مفسد قوم کو برباد کر کے تمھیں اس کی جگہ سربلند کیا، وہی خدا تمھیں برباد کر کے دوسروں کو تمھارا جانشین بنا سکتا ہے اگر تم بھی عاد کی طرح مفسد بن جاؤ۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: حاشیہ ۵۲)

لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

جو ایمان لے آئے تھے، کہا: "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کا پیغمبر ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اُسے ہم مانتے ہیں۔" اُن بڑائی کے مدعیوں نے کہا: "جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔"

پھر انھوں نے اُس اُونٹنی کو مار ڈالا[۶۱] اور پُورے تمرّد کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گزرے، اور صالحؑ سے کہہ دیا کہ "لے آ وہ عذاب جس کی تُو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے۔" آخرِ کار ایک دَہلا دینے والی آفت[۶۲] نے انُھیں آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اَوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اور صالحؑ یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے میری قوم! میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی، مگر میں کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔"

---

۶۱ – اگرچہ مارا ایک شخص نے تھا، جیسا کہ سورۂ قمر اور سورۂ شمس میں ارشاد ہوا ہے، لیکن چونکہ پوری قوم اُس مجرم کی پشت پر تھی اور وہ دراصل اِس جرم میں قوم کی مرضی کا آلۂ کار تھا، اس لیے الزام پوری قوم پر عائد کیا گیا ہے۔ ہر وہ گناہ جو قوم کی خواہش کے مطابق کیا جائے، یا جس کے ارتکاب کو قوم کی رضا اور پسندیدگی حاصل ہو، ایک قومی گناہ ہے، خواہ اس کا ارتکاب کرنے والا ایک فردِ واحد ہو۔ صرف یہی نہیں، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ جو گناہ قوم کے درمیان عَلَی الاعلان کیا جائے اور قوم اسے گوارا کرے، وہ بھی قومی گناہ ہے۔

وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَهۡوَةً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ‌ ؕ

اور لُوطؑ کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا، پھر یاد کرو جب اُس نے اپنی قوم[۶۳] سے کہا: "کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فُحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے[۶۴] اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔

۶۲ – اس آفت کو یہاں "رجفہ" (اضطراب انگیز، ہلا مارنے والی) کہا گیا ہے اور دوسرے مقامات پر اسی کے لیے "صَیْحَۃ" (چیخ)، "صاعقہ" (کڑاکا) اور "طاغیہ" (سخت زور کی آواز) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

۶۳ – یہ قوم اس علاقے میں رہتی تھی جسے آج کل شرقِ اُردُن (Trans Jordan) کہا جاتا ہے اور عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس قوم کے صدر مقام کا نام "سدوم" بتایا گیا ہے، جو یا تو بُحیرۂ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا، یا اب بحیرۂ مُردار میں غرق ہو چکا ہے۔ تَلْمُود میں لکھا ہے کہ سَدُوم کے علاوہ ان کے چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے، اور ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا کہ میلوں تک بس ایک باغ ہی باغ تھا، جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پر مستی طاری ہونے لگتی تھی۔ مگر آج اس قوم کا نام و نشان دنیا سے بالکل ناپید ہو چکا ہے اور یہ بھی متعین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بحیرۂ مردار ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے جسے آج تک بحرِ لوط کہا جاتا ہے۔

حضرت لُوط علیہ السّلام حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام و فلسطین و مصر میں گشت لگا کر دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے۔ پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے۔ اہلِ سدوم کو ان کی قوم اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ شاید ان کا رشتہ داری کا تعلق اس قوم سے ہو گا۔

یہودیوں کی تحریف کردہ بائبل میں حضرت لُوطؑ کی سیرت پر جہاں اور بہت سے سیاہ دھبے لگائے گئے ہیں، وہاں ایک دھبّا یہ بھی ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ سے لڑ کر سدوم کے علاقے میں چلے گئے تھے (پیدائش، باب ۱۳، آیت ۱-۱۲)۔ مگر قرآن اس غلط بیانی کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے انھیں رسول بنا کر اس قوم کی طرف بھیجا تھا۔

۶۴ – دوسرے مقامات پر اس قوم کے بعض اور اخلاقی جرائم کا بھی ذکر آیا ہے، مگر یہاں اس کے سب سے بڑے جرم کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے جس کی وجہ سے خدا کا عذاب اس پر نازل ہوا۔

یہ قابلِ نفرت فعل جس کی بدولت اس قوم نے شہرتِ دوام حاصل کی ہے، اس کے ارتکاب سے تو بدکردار انسان کبھی باز نہیں آئے، لیکن یہ فخر صرف یونان کو حاصل ہے کہ اس کے فلاسفہ نے اس گھناؤنے جرم کو اخلاقی خوبی کے مرتبے تک اٹھانے کی کوشش کی، اور اس کے بعد جو کسر باقی رہ گئی تھی اسے جدید مغربی تہذیب نے پورا کیا کہ علانیہ اس کے حق میں زبردست پروپیگنڈا کیا گیا، یہاں تک کہ بعض ملکوں کی مجالسِ قانون ساز نے اسے باقاعدہ جائز ٹھیرا دیا۔ حالانکہ یہ بالکل ایک صریح حقیقت ہے کہ

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ

حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔" مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ "نکالو اِن لوگوں کو اپنی بستیوں سے، بڑے پاکباز بنتے ہیں یہ۔"[۶۵] آخرِ کار ہم نے لُوطؑ اور

مباشرتِ ہم جنس قطعی طور پر وضعِ فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ذی حیات انواع میں نر و مادہ کا فرق محض تناسُل اور بقائے نوع کے لیے رکھا ہے، اور نوعِ انسانی کے اندر اس کی مزید غرض یہ بھی ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد مل کر ایک خاندان وجود میں لائیں اور اُس سے تمدُّن کی بنیاد پڑے۔ اسی مقصد کے لیے مرد اور عورت کی دو الگ صِنفیں بنائی گئی ہیں، ان میں ایک دوسرے کے لیے صِنفی کشش پیدا کی گئی ہے، ان کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب ایک دوسرے کے جواب میں مقاصدِ زوجیّت کے لیے عین مناسب بنائی گئی ہے اور ان کے جذب و انجذاب میں وہ لذّت رکھی گئی ہے جو فطرت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے بیک وقت داعی و محرک بھی ہے اور اس خدمت کا صلہ بھی۔ مگر جو شخص فطرت کی اس اسکیم کے خلاف عمل کر کے اپنے ہم جنس سے شہوانی لذّت حاصل کرتا ہے، وہ ایک ہی وقت میں متعدّد جرائم کا مُرتکب ہوتا ہے۔ اوّلاً: وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبعی ساخت اور نفسیاتی ترکیب سے جنگ کرتا ہے اور اس میں خللِ عظیم برپا کر دیتا ہے، جس سے دونوں کے جسم، نفس اور اخلاق پر نہایت بُرے اثرات مترتّب ہوتے ہیں۔ ثانیاً: وہ فطرت کے ساتھ غداری و خیانت کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ فطرت نے جس لذت کو نوع اور تمدُّن کی خدمت کا صلہ بنایا تھا اور جس کے حصول کو فرائض اور ذمہ داریوں اور حُقوق کے ساتھ وابستہ کیا تھا، وہ اسے کسی خدمت کی بجا آوری اور کسی فرض اور حق کی ادائیگی اور کسی ذمہ داری کے التزام کے بغیر چُرا لیتا ہے۔ ثالثاً: وہ انسانی اجتماع کے ساتھ کھلی بددیانتی کرتا ہے کہ جماعت کے قائم کیے ہوئے تمدُّنی اداروں سے فائدہ تو اُٹھا لیتا ہے، مگر جب اس کی اپنی باری آتی ہے تو حقوق اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے بجائے اپنی قوتوں کو پوری خود غرضی کے ساتھ ایسے طریقے پر استعمال کرتا ہے جو اجتماعی تمدُّن و اخلاق کے لیے صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ ایجاباً مُضرّت رساں ہے۔ وہ اپنے آپ کو نسل اور خاندان کی خدمت کے لیے نااہل بناتا ہے، اپنے ساتھ کم از کم ایک مرد کو غیر طبعی زنانہ پن میں مبتلا کرتا ہے، اور کم از کم دو عورتوں کے لیے بھی صنفی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

۶۵ – اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ صرف بے حیا اور بدکردار اور بد اخلاق ہی نہ تھے بلکہ اخلاقی پستی میں اس حد تک گر گئے تھے کہ انھیں اپنے درمیان چند نیک انسانوں اور نیکی کی طرف بلانے والوں اور بدی پر ٹوکنے والوں کا وجود تک گوارا نہ تھا۔ وہ بدی میں یہاں تک غرق ہو چکے تھے کہ اصلاح کی آواز کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور پاکی کے اس تھوڑے سے عُنصر کو بھی نکال دینا چاہتے تھے جو اُن کی گھناؤنی فضا میں باقی رہ گیا تھا۔ اسی حد کو پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اِستیصال کا فیصلہ صادر ہوا۔ کیونکہ جس قوم کی اجتماعی زندگی میں پاکیزگی کا ذرا سا عُنصر بھی باقی نہ رہ سکے پھر اسے زمین پر زندہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ ع

اس کے گھر والوں کو ـــــ بجز اس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں[۶۶] میں تھی ـــــ بچا کر نکال دیا اور اس قوم پر برسائی ایک[۶۷] بارش، پھر دیکھو کہ اُن مجرموں کا کیا انجام[۶۸] ہوا۔ ع

سڑے ہوئے پھلوں کے ٹوکرے میں جب تک چند اچھے پھل موجود ہوں، اس وقت تک تو ٹوکرے کو رکھا جاسکتا ہے، مگر جب وہ پھل بھی اس میں سے نکل جائیں تو پھر اس ٹوکرے کا کوئی مَصرَف اس کے سوا نہیں رہتا کہ اُسے کسی گھورے پر اُلٹ دیا جائے۔

۶۶ – دوسرے مقامات پر تصریح ہے کہ حضرت لُوطؑ کی یہ بیوی، جو غالباً اسی قوم کی بیٹی تھی، اپنے کافر رشتہ داروں کی ہم نوا رہی اور آخر وقت تک اس نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اس لیے عذاب سے پہلے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت لوطؑ اور ان کے ایمان دار ساتھیوں کو ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو ہدایت فرما دی کہ اس عورت کو ساتھ نہ لیا جائے۔

۶۷ – بارش سے مراد یہاں پانی کی بارش نہیں بلکہ پتھروں کی بارش ہے، جیسا کہ دوسرے مقامات پر قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے۔ نیز یہ بھی قرآن میں ارشاد ہُوا ہے کہ اُن کی بستیاں اُلٹ دی گئیں اور انھیں تلپٹ کر دیا گیا۔

۶۸ – یہاں اور دوسرے مقامات پر قرآنِ مجید میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ عملِ قومِ لُوطؑ ایک بدترین گناہ ہے جس پر ایک قوم اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار ہوئی۔ اس کے بعد یہ بات ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے معلوم ہوئی کہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس سے معاشرے کو پاک رکھنے کی کوشش کرنا حکومت اسلامی کے فرائض میں سے ہے، اور یہ کہ اس جرم کے مرتکبین کو سخت سزا دی جانی چاہیے۔ حدیث میں مختلف روایات جو حضورؐ سے مروی ہیں، ان میں سے کسی میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں کہ اقتلوا الفاعل والمفعول بہٖ (فاعل اور مفعول کو قتل کردو)۔ کسی میں اس حکم پر اتنا اضافہ اور ہے کہ احصنا اولم یحصنا (شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ)۔ اور کسی میں ہے: فارجموا الاعلی والاسفل (اُوپر اور نیچے والا، دونوں سنگسار کیے جائیں)۔ لیکن چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسا کوئی مُقدّمہ پیش نہیں ہوا، اس لیے قطعی طور پر یہ بات متعین نہ ہوسکی کہ اس کی سزا کس طرح دی جائے۔ صحابۂ کرامؓ میں سے حضرت علیؓ کی رائے یہ ہے کہ مجرم تلوار سے قتل کیا جائے اور دفن کرنے کے بجائے اس کی لاش جلائی جائے۔ اسی رائے سے حضرت ابوبکرؓ نے اتفاق فرمایا ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی رائے یہ ہے کہ کسی بوسیدہ عمارت کے نیچے کھڑا کرکے وہ عمارت ان پر ڈھا دی جائے۔ ابنِ عباسؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ بستی کی سب سے اُونچی عمارت پر سے ان کو سر کے بل پھینک دیا جائے اور اُوپر سے پتھر برسائے جائیں۔ فقہا میں سے امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ فاعل و مفعول واجب القتل ہیں، خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ شَعْبی، زُہری، مالک اور احمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ ان کی سزا رجم ہے۔ سعید بن مُسَیّب، عطاء، حسن بصری، ابراہیم نَخَعی، سفیان ثَوری اور اَوزاعی رحمہم اللہ کی رائے میں اس جرم پر وہی سزا دی جائے گی جو زنا کی سزا ہے، یعنی

وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ

اور مَدیَن[۶۹] والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا: "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی

غیر شادی شدہ کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور جلاوطن کر دیا جائے گا، اور شادی شدہ کو رجم کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے میں اس پر کوئی حد مقرر نہیں ہے، بلکہ یہ فعل تعزیر کا مستحق ہے، جیسے حالات و ضروریات ہوں ان کے لحاظ سے کوئی عبرت ناک سزا اس پر دی جا سکتی ہے۔ ایک قول امام شافعیؒ سے بھی اسی کی تائید میں منقول ہے۔

معلوم رہے کہ آدمی کے لیے یہ بات قطعی حرام ہے کہ وہ خود اپنی بیوی کے ساتھ عملِ قومِ لُوط کرے۔ ابوداؤد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ ملعون من اتی المرأۃ فی دبرھا (عورت سے یہ فعل کرنے والا ملعون ہے)۔ ابنِ ماجہ اور مُسنَدِ احمد میں حضورؐ کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ لا ینظر اللّٰہ الی رجل جامع امرأتہ فی دبرھا (اللہ اُس مرد کی طرف ہرگز نظرِ رحمت سے نہ دیکھے گا جو عورت سے اِس فعل کا ارتکاب کرے)۔ ترمذی میں آپؐ کا یہ فرمان ہے کہ من اتی حائضا او امرأۃ فی دبرھا او کاھنا فصدّقہ فقد کفر بما انزل علٰی محمّدؐ (جس نے حائضہ عورت سے مجامعت کی، یا عورت کے ساتھ عملِ قومِ لُوط کا ارتکاب کیا، یا کاہن کے پاس گیا اور اس کی پیشین گوئیوں کی تصدیق کی، اُس نے اس تعلیم سے کفر کیا جو محمدؐ پر نازل ہوئی ہے)۔

۶۹ – مَدیَن کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحرِ احمر اور خلیج عَقَبَہ کے کنارے پر واقع تھا، مگر جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہُوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہراہ بحرِ احمر کے کنارے یمن سے مکّہ اور یَنْبُوع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی، اور ایک دوسری تجارتی شاہراہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی، اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں واقع تھیں۔ اسی بنا پر عرب کا بچہ بچہ مَدیَن سے واقف تھا، اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی۔ کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات دن اس کے آثارِ قدیمہ کے درمیان سے گزرتے تھے۔

اہلِ مَدیَن کے متعلق ایک اور ضروری بات، جس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے، یہ ہے کہ یہ لوگ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے مِدیان کی طرف منسوب ہیں جو ان کی تیسری بیوی قَطُورا کے بطن سے تھے۔ قدیم زمانے کے قاعدے کے مطابق جو لوگ کسی بڑے آدمی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے، وہ رفتہ رفتہ اسی کی آل اولاد میں شمار ہو کر بنی فُلاں کہلانے لگتے تھے۔ اسی قاعدے پر عرب کی آبادی کا بڑا حصہ بنی اسماعیل کہلایا۔ اور اولادِ یعقوب کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہونے والے لوگ سب کے سب بنی اسرائیل کے جامع نام کے تحت کھپ گئے۔ اسی طرح مدین کے علاقے کی ساری آبادی بھی جو مِدیان بن ابراہیمؑ کے زیرِ اثر آئی، بنی مدیان کہلائی اور ان کے مُلک کا نام ہی مَدیَن یا مِدیان مشہور ہو گیا۔ اس تاریخی حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ اس قوم کو دینِ حق کی آواز پہلی مرتبہ حضرت شعیبؑ کے ذریعے سے پہنچی تھی۔ درحقیقت بنی اسرائیل کی طرح ابتداءً وہ بھی مسلمان ہی تھے اور شعیب علیہ السلام کے ظہور کے وقت ان کی حالت ایک بگڑی ہوئی مسلمان

مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ

کرو، اُس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی صاف رہنمائی آ گئی ہے، لٰہذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو اُن کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو،[70] اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے،[71] اسی میں تمھاری بھلائی ہے، اگر تم واقعی مومن ہو۔[72] اور (زندگی کے) ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوف زدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جب کہ

قوم کی سی تھی جیسی ظہورِ موسیٰ علیہ السلام کے وقت بنی اسرائیل کی حالت تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد چھ سات سو برس تک مشرک اور بد اخلاق قوموں کے درمیان رہتے رہتے یہ لوگ شرک بھی سیکھ گئے تھے اور بد اخلاقیوں میں بھی مبتلا ہو گئے تھے، مگر اس کے باوجود ایمان کا دعویٰ اور اس پر فخر برقرار تھا۔

۷۰ – اس سے معلوم ہُوا کہ اس قوم میں دو بڑی خرابیاں پائی جاتی تھیں: ایک شرک، دوسرے تجارتی معاملات میں بد دیانتی۔ اور انھی دونوں چیزوں کی اصلاح کے لیے حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے۔

۷۱ – اس فقرے کی جامع تشریح اسی سورۂ اَعراف کے حواشی ۴۴ و ۴۵ میں گزر چکی ہے۔ یہاں خُصوصیّت کے ساتھ حضرت شعیبؑ کے اس قول کا اشارہ اس طرف ہے کہ دینِ حق اور اخلاقِ صالحہ پر زندگی کا جو نظام انبیائے سابقین کی ہدایت و رہنمائی میں قائم ہو چکا تھا، اب تم اسے اپنی اعتقادی گمراہیوں اور اخلاقی بدراہیوں سے خراب نہ کرو۔

۷۲ – اس فقرے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود مدعیِ ایمان تھے۔ جیسا کہ اُوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں، یہ دراصل بگڑے ہوئے مسلمان تھے اور اعتقادی و اخلاقی فساد میں مبتلا ہونے کے باوجود ان کے اندر نہ صرف ایمان کا دعویٰ باقی تھا بلکہ اس پر انھیں فخر بھی تھا۔ اسی لیے حضرت شعیبؑ نے فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمھارے نزدیک خیر اور بھلائی راست بازی اور دیانت میں ہونی چاہیے، اور تمھارا معیارِ خیر و شر ان دنیا پرستوں سے مختلف ہونا چاہیے جو خدا اور آخرت کو نہیں مانتے۔

كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

الجزء ۹

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ۭ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۭ

تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمھیں بہت کر دیا، اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ اگر تم میں سے ایک گروہ اُس تعلیم پر جس کے ساتھ مَیں بھیجا گیا ہوں، ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا، تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو، یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے، اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا کہ "اے شعیبؑ! ہم تجھے اور اُن لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے، ورنہ تم لوگوں کو ہماری مِلّت میں واپس آنا ہوگا۔" شعیبؑ نے جواب دیا "کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمھاری مِلّت میں پلٹ آئیں جب کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لیے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں اِلّا یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے[۷۳]۔

۷۳ ۔ یہ فقرہ اُسی معنیٰ میں ہے جس میں اِنْ شاءَ اللہ کا لفظ بولا جاتا ہے، اور جس کے متعلق سورہ کہف (آیات ۲۳-۲۴) میں ارشاد ہُوا ہے کہ کسی چیز کے متعلق دعوے کے ساتھ یہ نہ کہہ دیا کرو کہ میں ایسا کروں گا، بلکہ اس طرح کہا کرو کہ اگر اللہ چاہے گا تو

وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۭ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ

ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، اُسی پر ہم نے اعتماد کرلیا۔ اے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کردے اور تُو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے، آپس میں کہا: "اگر تم نے شعیبؑ کی پیروی قبول کر لی تو برباد ہو جاؤ گے۔"[۷۴] مگر ہُوا یہ کہ ایک دہلا دینے والی آفت نے اُن کو آلیا اور وہ

ایسا کروں گا۔ اس لیے کہ مومن، جو اللہ تعالیٰ کی سلطانی و بادشاہی کا اور اپنی بندگی و تابعیّت کا ٹھیک ٹھیک اِدراک رکھتا ہے، کبھی اپنے بل بُوتے پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں فُلاں بات کر کے رہوں گا، یا فُلاں حرکت ہرگز نہ کروں گا، بلکہ وہ جب کہے گا تو یوں کہے گا کہ میرا ارادہ ایسا کرنے کا یا نہ کرنے کا ہے لیکن میرے اس ارادے کا پورا ہونا میرے مالک کی مَشِیّت پر موقوف ہے، وہ توفیق بخشے گا تو اس میں کامیاب ہو جاؤں گا ورنہ ناکام رہ جاؤں گا۔

۷۴ – اس چھوٹے سے فقرے پر سے سرسری طور پر نہ گزر جائیے۔ یہ ٹھیر کر بہت سوچنے کا مقام ہے۔ مَدیَن کے سردار اور لیڈر دراصل یہ کہہ رہے تھے اور اسی بات کا اپنی قوم کو بھی یقین دلا رہے تھے کہ شعیبؑ جس ایمان داری اور راست بازی کی دعوت دے رہا ہے اور اخلاق و دیانت کے جن مستقل اُصولوں کی پابندی کرانا چاہتا ہے، اگر ان کو مان لیا جائے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے اگر ہم بالکل ہی سچّائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے کھرے سودے کرنے لگیں۔ اور ہم جو دنیا کی دو سب سے بڑی تجارتی شاہراہوں کے چَوراہے پر بستے ہیں، اور مصر و عراق کی عظیم الشان متمدّن سلطنتوں کی سرحد پر آباد ہیں، اگر ہم قافلوں کو چھیڑنا بند کر دیں اور بے ضرر اور پُر امن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو مَعاشی اور سیاسی فوائد ہمیں اپنی موجودہ جُغرافی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے اور آس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ باقی نہ رہے گی ـــــ یہ بات صرف قومِ شعیبؑ کے سرداروں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے میں بگڑے ہوئے لوگوں نے حق اور راستی اور دیانت کی رَوِش میں ایسے ہی خطرات محسوس کیے ہیں۔ ہر دور کے مفسدین کا یہی خیال رہا ہے کہ تجارت اور سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات جھوٹ اور بے ایمانی اور بداخلاقی کے بغیر نہیں چل سکتے۔ ہر جگہ دعوتِ حق کے مقابلے میں جو زبردست

دَارِهِمۡ جٰثِمِیۡنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا شُعَیۡبًا کَاَنۡ لَّمۡ یَغۡنَوۡا فِیۡهَا ۚۛ اَلَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا شُعَیۡبًا کَانُوۡا هُمُ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۹۲﴾ فَتَوَلّٰی عَنۡهُمۡ وَ قَالَ یٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُکُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ وَ نَصَحۡتُ لَکُمۡ ۚ فَکَیۡفَ اٰسٰی عَلٰی قَوۡمٍ کٰفِرِیۡنَ ﴿۹۳﴾ ع

اپنے گھروں میں اَوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا، وہ ایسے مِٹے کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ شعیبؑ کے جُھٹلانے والے ہی آخرِ کار برباد ہو کر رہے[۷۵]۔ اور شعیبؑ یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نِکل گیا کہ ”اے برادرانِ قوم! میں نے اپنے رب کے پیغامات تمھیں پہنچا دیے اور تمھاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اُس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبولِ حق سے انکار کرتی ہے[۷۶]۔“ ع

عُذرات پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی رہا ہے کہ اگر دنیا کی چلتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اس دعوت کی پیروی کی جائے گی تو قوم تباہ ہو جائے گی۔

۷۵ – مَدیَن کی یہ تباہی مدت ہائے دراز تک آس پاس کی قوموں میں ضربُ المَثَل رہی ہے۔ چنانچہ زَبورِ داؤدؑ میں ایک جگہ آتا ہے کہ اے خدا! فُلاں فُلاں قوموں نے تیرے خلاف عہد باندھ لیا ہے، لہٰذا تُو ان کے ساتھ وہی کر جو تو نے مِدیان کے ساتھ کیا (۸۳: ۵ تا ۹)۔ اور یَسَعیاہ نبی ایک جگہ بنی اسرائیل کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اَشُور والوں سے نہ ڈرو، اگرچہ وہ تمھارے لیے مصریوں کی طرح ظالم بنے جا رہے ہیں، لیکن کچھ دیر نہ گزرے گی کہ رب الافواج ان پر اپنا کوڑا برسائے گا اور ان کا وہی حشر ہو گا جو مِدیان کا ہوا۔ (یَسَعیاہ ۱۰: ۲۱ تا ۲۶)

۷۶ – یہ جتنے قصے یہاں بیان کیے گئے ہیں ان سب میں ”سِرِّ دلبراں در حدیثِ دیگراں“ کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ہر قصّہ اُس معاملے پر پورا پورا چسپاں ہوتا ہے جو اُس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی قوم کے درمیان پیش آ رہا تھا۔ ہر قصّے میں ایک فریق نبی ہے، جس کی تعلیم، جس کی دعوت، جس کی نصیحت و خیر خواہی، اور جس کی ساری باتیں بعینہٖ وہی ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تھیں۔ اور دوسرا فریق حق سے منہ موڑنے والی قوم ہے، جس کی اعتقادی گمراہیاں، جس کی اخلاقی خرابیاں، جس کی جاہلانہ ہٹ دھرمیاں، جس کے سرداروں کا اِستِکبار، جس کے منکروں کا اپنی ضلالت پر اصرار، غرض سب کچھ وہی ہے جو قریش میں پایا جاتا تھا۔ پھر ہر قصّے میں منکر قوم کا جو انجام پیش کیا گیا ہے، اس سے دراصل قریش کو عبرت

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اُس بستی کے لوگوں کو پہلے تنگی اور سختی میں مُبتلا نہ کیا ہو، اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اُتر آئیں۔ پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پُھولے اور کہنے لگے کہ ”ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور بُرے دن آتے ہی رہے ہیں۔“ آخرِ کار ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا اور انھیں خبر تک نہ ہوئی۷۷۔ اگر بستیوں کے

دلائی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی بات نہ مانی اور اصلاحِ حال کا جو موقع تمھیں دیا جا رہا ہے اسے اندھی ضد میں مبتلا ہو کر کھو دیا، تو آخرِ کار تمھیں بھی اسی تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑے گا جو ہمیشہ سے گمراہی و فساد پر اصرار کرنے والی قوموں کے حصّے میں آتی رہی ہے۔

۷۷ – ایک ایک نبی اور ایک ایک قوم کا معاملہ الگ الگ بیان کرنے کے بعد اب وہ جامع ضابطہ بیان کیا جا رہا ہے جو ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کی بِعثَت کے موقع پر اختیار فرمایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی نبی بھیجا گیا تو پہلے اس قوم کے خارجی ماحول کو قبولِ دعوت کے لیے نہایت سازگار بنایا گیا۔ یعنی اس کو مصائب اور آفات میں مبتلا کیا گیا۔ قحط، وبا، تجارتی خسارے، جنگی شکست یا اور اسی طرح کی تکلیفیں اس پر ڈالی گئیں۔ تاکہ اس کا دل نرم پڑے، اس کی شیخی اور تکبّر سے اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی ہو، اس کا غرورِ طاقت اور نشۂ دولت ٹوٹ جائے، اپنے ذرائع و وسائل اور اپنی قوتوں اور قابلیتوں پر اس کا اعتماد شکست ہو جائے، اُسے محسوس ہو کہ اُوپر کوئی اور طاقت بھی ہے جس کے ہاتھ میں اس کی قسمت کی باگیں ہیں، اور اس طرح اس کے کان نصیحت کے لیے کُھل جائیں اور وہ اپنے خدا کے سامنے عاجزی کے ساتھ جھک جانے پر آمادہ ہو جائے۔ پھر جب اس سازگار ماحول میں بھی اس کا دل قبولِ حق کی طرف مائل نہیں ہوتا تو اس کو خوش حالی کے فتنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، اور یہاں سے اس کی بربادی کی تمہید شروع ہو جاتی ہے۔ جب وہ نعمتوں سے مالا مال ہونے لگتی ہے تو اپنے بُرے دن بھول جاتی ہے اور اس کے کج فہم رہنما اس کے ذہن میں تاریخ کا یہ احمقانہ تصور بٹھاتے ہیں کہ حالات کا اُتار چڑھاؤ اور قسمت کا بناؤ اور بگاڑ کسی حکیم کے انتظام میں اخلاقی بنیادوں پر نہیں ہو رہا ہے، بلکہ ایک اندھی طبیعت بالکل غیر اخلاقی

الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ

لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی رَوِش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے

اسباب سے کبھی اچھے اور کبھی بُرے دن لاتی ہی رہتی ہے، لہٰذا مصائب اور آفات کے نُزول سے کوئی اخلاقی سبق لینا اور کسی ناصح کی نصیحت قُبول کر کے خدا کے آگے زاری و تضرُّع کرنے لگنا بجز ایک طرح کی نفسی کمزوری کے اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وہ احمقانہ ذہنیت ہے جس کا نقشہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کھینچا ہے: لا یزال البلاء بالمؤمن حتّٰی یخرج نقیًا من ذنوبہٖ والمنافقُ مَثَلُہٗ کمثلِ الحِمار لا یدری فیمَ رَبَطہٗ اھلہٗ ولَا فِیمَ ارسلوہ۔ یعنی ”مصیبت مومن کی تو اصلاح کرتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ اِس بھٹی سے نکلتا ہے تو ساری کھوٹ سے صاف ہو کر نکلتا ہے، لیکن منافق کی حالت بالکل گدھے کی سی ہوتی ہے جو کچھ نہیں سمجھتا کہ اس کے مالک نے کیوں اسے باندھا تھا اور کیوں اسے چھوڑ دیا۔“ پس جب کسی قوم کا حال یہ ہوتا ہے کہ نہ مصائب سے اس کا دل خدا کے آگے جھکتا ہے، نہ نعمتوں پر وہ شکر گزار ہوتی ہے، اور نہ کسی حال میں اصلاح قبول کرتی ہے، تو پھر اس کی بربادی اِس طرح اس کے سر پر منڈلانے لگتی ہے جیسے پورے دن کی حاملہ عورت کہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کب اس کا وضعِ حمل ہو جائے۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جس ضابطے کا ذکر فرمایا ہے، ٹھیک یہی ضابطہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت کے موقع پر بھی برتا گیا، اور شامت زدہ قوموں کے جس طرزِ عمل کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، ٹھیک وہی طرزِ عمل سورۂ اَعراف کے نُزول کے زمانے میں قریش والوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ حدیث میں عبداللہؓ بن مسعود اور عبداللہ بن عباسؓ دونوں کی مُتَّفَقہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت کے بعد جب قریش کے لوگوں نے آپؐ کی دعوت کے خلاف سخت رَدِیّہ اختیار کرنا شروع کیا تو حضورؐ نے دعا کی کہ خدایا! یوسفؑ کے زمانے میں جیسا ہفت سالہ قحط پڑا تھا، ویسے ہی قحط سے اِن لوگوں کے مقابلے میں میری مدد کر۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں سخت قحط میں مبتلا کر دیا، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ مُردار کھانے لگے، چمڑے اور ہڈیاں اور اُون تک کھا گئے۔ آخرِ کار مکے کے لوگوں نے، جن میں ابوسفیان پیش پیش تھا، حضورؐ سے درخواست کی کہ ہمارے لیے خدا سے دعا کیجیے۔ مگر جب آپؐ کی دعا سے اللہ نے وہ بُرا وقت ٹال دیا اور بھلے دن آئے تو اُن لوگوں کی گردنیں پہلے سے زیادہ اکڑ گئیں، اور جن کے دل تھوڑے بہت پسیج گئے تھے ان کو بھی اشرارِ قوم نے یہ کہہ کہہ کر ایمان سے روکنا شروع کر دیا کہ میاں! یہ تو زمانے کا اُتار چڑھاؤ ہے۔ پہلے بھی آخر قحط آتے ہی رہے ہیں، کوئی نئی بات تو نہیں ہے کہ اس مرتبہ ایک لمبا قحط پڑ گیا، لہٰذا ان چیزوں سے دھوکا کھا کر محمدؐ کے پھندے میں نہ پھنس جانا۔ یہ تقریریں اُس زمانے میں ہو رہی تھیں جب یہ سورۂ اَعراف نازل ہوئی ہے۔ اس لیے قرآنِ مجید کی یہ آیات ٹھیک اپنے موقع پر چسپاں ہوتی ہیں اور اسی پَس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے اِن کی معنویت پوری طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: یونُس، آیت ۲۱۔ النحل ۱۱۲۔ المومنون ۵-۶-۷۔ الدُّخان ۹-۱۶)

الْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۹۷﴾ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ

دروازے کھول دیتے، مگر انھوں نے تو جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اُس بُری کمائی کے حساب میں انھیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔ پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک اُن پر رات کے وقت نہ آجائے گی جب کہ وہ سوتے پڑے ہوں؟ یا انھیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال[۷۸] سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔ع

اور کیا اُن لوگوں کو جو سابق اہلِ زمین کے بعد زمین کے وارث ہوتے ہیں، اِس امرِ واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انھیں پکڑ سکتے ہیں[۷۹]؟ (مگر وہ سبق آموز حقائق سے تغافل برتتے ہیں) اور ہم ان کے

۷۸ – اصل میں لفظ مَکْر استعمال ہُوا ہے، جس کے معنیٰ عربی زبان میں خفیہ تدبیر کے ہیں، یعنی کسی شخص کے خلاف ایسی چال چلنا کہ جب تک اس پر فیصلہ کُن ضرب نہ پڑ جائے، اس وقت تک اسے خبر نہ ہو کہ اس کی شامت آنے والی ہے، بلکہ ظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے وہ یہی سمجھتا رہے کہ سب اچھا ہے۔

۷۹ – یعنی ایک گِرنے والی قوم کی جگہ جو دوسری قوم اُٹھتی ہے اس کے لیے اپنی پیش رو قوم کے زوال میں کافی رہنمائی موجود ہوتی ہے۔ وہ اگر عقل سے کام لے تو سمجھ سکتی ہے کہ کچھ مدت پہلے جو لوگ اِسی جگہ دادِ عیش دے رہے تھے اور جن کی عظمت کا جھنڈا

عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾ تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠١﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٢﴾

دِلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سُنتے۔[80] یہ قومیں جن کے قصّے ہم تمھیں سُنا رہے ہیں (تمھارے سامنے مثال میں موجود ہیں) ان کے رسول ان کے پاس کُھلی کُھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر جس چیز کو وہ ایک دفعہ جُھٹلا چکے تھے پھر اُسے وہ ماننے والے نہ تھے۔ دیکھو اس طرح ہم منکرینِ حق کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں۔[81] ہم نے ان میں سے اکثر میں کوئی پاسِ عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق ہی پایا۔[82]

یہاں لہرا رہا تھا انھیں فکر و عمل کی کن غلطیوں نے برباد کیا، اور یہ بھی محسوس کر سکتی ہے کہ جس بالاتر اقتدار نے کل اُنھیں اُن کی غلطیوں پر پکڑا تھا اور اُن سے یہ جگہ خالی کرالی تھی، وہ آج کہیں چلا نہیں گیا ہے، نہ اس سے کسی نے یہ مقدرت چھین لی ہے کہ اِس جگہ کے موجودہ ساکنین اگر وہی غلطیاں کریں جو سابق ساکنین کر رہے تھے تو وہ ان سے بھی اسی طرح جگہ خالی نہ کرا سکے گا جس طرح اس نے اُن سے خالی کرائی تھی۔

۸۰ – یعنی جب وہ تاریخ سے اور عبرتناک آثار کے مشاہدے سے سبق نہیں لیتے اور اپنے آپ کو خود بُھلاوے میں ڈالتے ہیں تو پھر خدا کی طرف سے بھی انھیں سوچنے سمجھنے اور کسی ناصح کی بات سننے کی توفیق نہیں ملتی۔ خدا کا قانونِ فطرت یہی ہے کہ جو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے، اس کی بینائی تک آفتابِ روشن کی کوئی کرن نہیں پہنچ سکتی۔ اور جو خود نہیں سننا چاہتا، اسے پھر کوئی کچھ نہیں سُنا سکتا۔

۸۱ – پچھلی آیت میں جو ارشاد ہُوا تھا کہ ”ہم ان کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سنتے“، اس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خود فرما دی ہے۔ اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دلوں پر مُہر لگانے سے مراد ذہنِ انسانی کا اُس نفسیاتی قانون کی زد میں آجانا ہے جس کی رُو سے ایک دفعہ جاہلی تعصّبات یا نفسانی اغراض کی بِنا پر حق سے مُنہ موڑ لینے کے بعد پھر انسان اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے اُلجھاؤ میں اُلجھتا ہی چلا جاتا ہے، اور کسی دلیل، کسی مشاہدے اور کسی تجربے سے اس کے دل کے دروازے قبولِ حق کے لیے نہیں کُھلتے۔

۸۲ – ”کوئی پاسِ عہد نہ پایا“، یعنی کسی قسم کے عہد کا پاس بھی نہ پایا، نہ اُس فطری عہد کا پاس جس میں پیدائشی طور پر

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ

پھر اُن قوموں کے بعد (جن کا ذکر اُوپر کیا گیا) ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا،[۸۳] مگر انھوں نے بھی ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا،[۸۴]

ہر انسان خدا کا بندہ اور پروردہ ہونے کی حیثیت سے بندھا ہُوا ہے، نہ اُس اجتماعی عہد کا پاس جس میں ہر فردِ بشر انسانی برادری کا ایک رُکن ہونے کی حیثیت سے بندھا ہوا ہے، اور نہ اُس ذاتی عہد کا پاس جو آدمی اپنی مصیبت اور پریشانی کے لمحوں میں یا کسی جذبۂ خیر کے موقع پر خدا سے بطورِ خود باندھا کرتا ہے۔ انھی تینوں عہدوں کے توڑنے کو یہاں فسق قرار دیا گیا ہے۔

۸۳ – اُوپر جو قصّے بیان ہوئے، ان سے مقصود یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ جو قوم خدا کا پیغام پانے کے بعد اسے ردّ کر دیتی ہے، اسے پھر ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ اس کے بعد اب موسیٰؑ و فرعون اور بنی اسرائیل کا قصہ کئی رکوعوں تک مسلسل چلتا ہے جس میں اس مضمون کے علاوہ چند اور اہم سبق بھی کفارِ قریش، یہود اور ایمان لانے والے گروہ کو دیے گئے ہیں۔

کفارِ قریش کو اس قصّے کے پیرایے میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دعوتِ حق کے ابتدائی مرحلوں میں حق اور باطل کی قوتوں کا جو تناسُب بظاہر نظر آتا ہے، اُس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ حق کی تو پوری تاریخ ہی اس بات پر گواہ ہے کہ وہ ایک فی قوم بلکہ ایک فی دنیا کی اقلیّت سے شروع ہوتا ہے اور بغیر کسی سروسامان کے اُس باطل کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتا ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں کی طاقت ہوتی ہے، پھر بھی آخرِ کار وہی غالب آکر رہتا ہے۔ نیز اس قصے میں ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ داعیِ حق کے مقابلے میں جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جن تدبیروں سے اس کی دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ کس طرح اُلٹی پڑتی ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ منکرینِ حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے اُن کو کتنی کتنی طویل مدّت تک سنبھلنے اور دُرست ہونے کے مواقع دیتا چلا جاتا ہے، اور جب کسی تنبیہ، کسی سبق آموز واقعے اور کسی روشن نشانی سے بھی وہ اثر نہیں لیتے تو پھر وہ انھیں کیسی عبرتناک سزا دیتا ہے۔

جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے ان کو اس قصّے میں دُہرا سبق دیا گیا ہے۔ پہلا سبق اس بات کا کہ اپنی قلّت و کمزوری کو اور مخالفینِ حق کی کثرت و شوکت کو دیکھ کر اُن کی ہمت نہ ٹوٹے، اور اللہ کی مدد آنے میں دیر ہوتے دیکھ کر وہ دل شکستہ نہ ہوں۔ دوسرا سبق اس بات کا کہ ایمان لانے کے بعد جو گروہ یہودیوں کی سی رَوِش اختیار کرتا ہے وہ پھر یہودیوں ہی کی طرح خدا کی لعنت میں گرفتار بھی ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کے سامنے ان کی اپنی عبرتناک تاریخ پیش کر کے انھیں باطل پرستی کے بُرے نتائج پر مُتنبّہ کیا گیا ہے اور اُس پیغمبرؐ پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے جو پچھلے پیغمبروںؑ کے لائے ہوئے دین کو تمام آمیزشوں سے پاک کر کے پھر اس کی اصلی صورت میں پیش کر رہا ہے۔

۸۴ – نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا، یعنی ان کو نہ مانا اور انھیں جادوگری قرار دے کر ٹالنے کی کوشش کی۔ جس طرح کسی

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ

پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔

موسیٰؑ نے کہا: "اے فرعون[85]! میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں، میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمھارے رب کی طرف سے

ایسے شعر کو جو شعریّت کا مکمل نمونہ ہو،تُک بندی سے تعبیر کرنا اور اس کا مذاق اُڑانا نہ صرف اس شعر کے ساتھ بلکہ نفسِ شاعری اور ذوقِ شعری کے ساتھ بھی ظلم ہے، اسی طرح وہ نشانیاں جو خود اپنے مِن جانبِ اللہ ہونے پر صریح گواہی دے رہی ہوں اور جن کے متعلق کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ گمان تک نہ کرسکتا ہو کہ سحر کے زور سے بھی ایسی نشانیاں ظاہر ہوسکتی ہیں، بلکہ جن کے متعلق خود فنِ سحر کے ماہرین نے شہادت دے دی ہو کہ وہ ان کے فن کی دست رس سے بالاتر ہیں، ان کو سحر قرار دینا نہ صرف ان نشانیوں کے ساتھ، بلکہ عقلِ سلیم اور صداقت کے ساتھ بھی ظلمِ عظیم ہے۔

۸۵ – لفظ فرعون کے معنیٰ ہیں: "سورج دیوتا کی اولاد"۔ قدیم اہلِ مصر سورج کو، جو اُن کا مہادیو یا ربِّ اعلیٰ تھا، رَع کہتے تھے اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا۔ اہلِ مصر کے اعتقاد کی رُو سے کسی فرماں روا کی حاکمیت کے لیے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ رَع کا جسمانی مظہر اور اُس کا ارضی نمایندہ ہو، اِسی لیے ہر شاہی خاندان جو مصر میں برسرِ اقتدار آتا تھا، اپنے آپ کو سورج بنسی بنا کر پیش کرتا، اور ہر فرماں روا جو تختِ نشین ہوتا، "فرعون" کا لقب اختیار کر کے باشندگانِ ملک کو یقین دلاتا کہ تمھارا رَبِّ اعلیٰ یا مہادیو میں ہوں۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰؑ کے قصّے کے سلسلے میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک وہ جس کے زمانے میں آپ پیدا ہوئے اور جس کے گھر میں آپ نے پرورش پائی۔ دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ لے کر پہنچے اور جو بالآخر غرق ہوا۔ موجودہ زمانے کے محققین کا عام میلان اس طرف ہے کہ پہلا فرعون رعمسیس دوم تھا جس کا زمانۂ حکومت ۱۲۹۲ سے ۱۲۲۵ قبلِ مسیح تک رہا۔ اور دوسرا فرعون جس کا یہاں ان آیات میں ذکر ہو رہا ہے، مِنفِتہ یا منفتاح تھا جو اپنے باپ رعمسیس دوم کی زندگی ہی میں شریکِ حکومت ہو چکا تھا اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا مالک ہوا۔ یہ قیاس بظاہر اس لحاظ سے مُشتبہ معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخِ وفات ۱۲۷۲ قبلِ مسیح ہے۔ لیکن بہرحال یہ تاریخی قیاسات ہی ہیں اور مصری، اسرائیلی اور عیسوی جنتریوں کے تطابق سے بالکل صحیح تاریخوں کا

رَّبِّکُمۡ فَاَرۡسِلۡ مَعِیَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنۡ کُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰیَۃٍ فَاۡتِ بِہَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلۡقٰی عَصَاہُ فَاِذَا ہِیَ ثُعۡبَانٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّ نَزَعَ یَدَہٗ فَاِذَا ہِیَ بَیۡضَآءُ لِلنّٰظِرِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾

صریح دلیلِ ماموریّت لے کر آیا ہوں، لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔[۸۶]"

فرعون نے کہا: "اگر تُو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچّا ہے تو اسے پیش کر۔"

موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدہا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا۔[۸۷] ع

حساب لگانا مشکل ہے۔

۸۶ – حضرت موسیٰؑ دو چیزوں کی دعوت لے کر فرعون کے پاس بھیجے گئے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی بندگی (اسلام) قبول کرے، دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل کی قوم کو جو پہلے سے مسلمان تھی، اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کر دے۔ قرآن میں ان دونوں دعوتوں کا کہیں یکجا ذکر کیا گیا ہے اور کہیں موقع و محل کے لحاظ سے صرف ایک ہی کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے۔

۸۷ – یہ دو نشانیاں حضرت موسیٰؑ کو اس امر کے ثبوت میں دی گئی تھیں کہ وہ اُس خدا کے نمایندے ہیں جو کائنات کا خالق اور فرماں روا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم اشارہ کر چکے ہیں، پیغمبروںؑ نے جب کبھی اپنے آپ کو فرستادۂ ربّ العالمین کی حیثیّت سے پیش کیا تو لوگوں نے ان سے یہی مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی ربّ العالمین کے نمایندے ہو تو تمھارے ہاتھوں سے کوئی ایسا واقعہ ظہور میں آنا چاہیے جو قوانینِ فطرت کی عام رَوش سے ہٹا ہُوا ہو اور جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہو کہ ربّ العالمین نے تمھاری صداقت ثابت کرنے کے لیے اپنی براہِ راست مداخلت سے یہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر کیا ہے۔ اِسی مطالبے کے جواب میں انبیاؑ نے وہ نشانیاں دکھائی ہیں جن کو قرآن کی اصطلاح میں "آیات" اور متکلّمین کی اصطلاح میں "معجزات" کہا جاتا ہے۔ ایسے نشانات یا معجزات کو جو لوگ قوانینِ فطرت کے تحت صادر ہونے والے عام واقعات قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، وہ درحقیقت کتاب اللہ کو ماننے اور نہ ماننے کے درمیان ایک ایسا مؤقف اختیار کرتے ہیں جو کسی طرح معقول نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لیے کہ قرآن جس جگہ صریح طور پر خارقِ عادت واقعہ کا ذکر کر رہا ہو وہاں سِیاق و سَباق کے بالکل خلاف ایک عادی واقعہ بنانے کی جِدّوجُہد محض ایک بھونڈی سُخن سازی ہے، جس کی ضرورت صرف اُن لوگوں کو پیش آتی ہے جو ایک طرف تو کسی ایسی کتاب پر ایمان نہیں لانا چاہتے جو خارقِ عادت واقعات کا ذکر کرتی ہو اور دوسری طرف آبائی مذہب کے پیدایشی معتقد ہونے کی وجہ سے اُس کتاب کا انکار بھی نہیں کرنا چاہتے جو فی الواقع خارقِ عادت واقعات کا ذکر کرتی ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ

اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ "یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے، تمھیں تمھاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے[۸۸]، اب کہو کیا کہتے ہو؟" پھر اُن سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے

معجزات کے باب میں اصل فیصلہ کُن سوال صرف یہ ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ نظامِ کائنات کو ایک قانون پر چلا دینے کے بعد معطّل ہو چکا ہے اور اب اِس چلتے ہوئے نظام میں کبھی کسی موقع پر مداخلت نہیں کر سکتا؟ یا وہ بالفعل اپنی سلطنت کی زمامِ تدبیر و انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، اور ہر آن اس کے احکام اِس سلطنت میں نافذ ہوتے ہیں، اور اُس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ اشیا کی شکلوں اور واقعات کی عادی رفتار میں جُزئی طور پر یا کُلّی طور پر جیسا چاہے اور جب چاہے تغیُّر کر دے؟ جو لوگ اس سوال کے جواب میں پہلی بات کے قائل ہیں، ان کے لیے معجزات کو تسلیم کرنا غیر ممکن ہے، کیونکہ معجزہ نہ ان کے تصوُّرِ خدا سے میل کھاتا ہے اور نہ تصوُّرِ کائنات سے۔ لیکن ایسے لوگوں کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر و تشریح کرنے کے بجائے اُس کا صاف صاف انکار کر دیں، کیونکہ قرآن نے تو اپنا زورِ بیان ہی خدا کے مقدم الذکر تصوّر کا ابطال اور مؤخر الذکر تصوّر کا اثبات کرنے پر صَرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص قرآن کے دلائل سے مطمئن ہو کر دوسرے تصور کو قبول کر لے، اس کے لیے معجزے کو سمجھنا اور تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ جب آپ کا عقیدہ ہی یہ ہو گا کہ اژدہے جس طرح پیدا ہُوا کرتے ہیں اسی طرح وہ پیدا ہو سکتے ہیں، اُس کے سوا کسی دوسرے ڈھنگ پر کوئی اژدہا پیدا کر دینا خدا کی قدرت سے باہر ہے، تو آپ مجبُور ہیں کہ ایسے شخص کے بیان کو قطعی طور پر جھٹلا دیں جو آپ کو خبر دے رہا ہو کہ ایک لاٹھی اژدہے میں تبدیل ہوئی اور پھر اژدہے سے لاٹھی بن گئی۔ لیکن اس کے برعکس اگر آپ کا عقیدہ یہ ہو کہ بے جان مادّے میں خدا کے حکم سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور خدا جس مادّے کو جیسی چاہے زندگی عطا کر سکتا ہے، تو آپ کے لیے خدا کے حکم سے لاٹھی کا اژدہا بننا اتنا ہی غیر عجیب واقعہ ہے جتنا اسی خدا کے حکم سے انڈے کے اندر بھرے ہوئے چند بے جان مادّوں کا اژدہا بن جانا غیر عجیب ہے۔ مُجرّد یہ فرق کہ ایک واقعہ ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے اور دوسرا واقعہ صرف تین مرتبہ پیش آیا، ایک کو غیر عجیب اور دوسرے کو عجیب بنا دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔

۸۸ – یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک غلام قوم کا ایک بے سرو سامان آدمی یکایک اُٹھ کر فرعون جیسے بادشاہ کے دربار میں جا کھڑا ہوتا ہے جو شام سے لیبیا تک اور بحرِ رُوم کے سواحل سے حَبَش تک کے عظیم الشان مُلک کا نہ صرف مُطلَق العِنان بادشاہ بلکہ معبود بنا ہُوا تھا، تو محض اُس کے اِس فعل سے کہ اس نے ایک لاٹھی کو اژدہا بنا دیا، اِتنی بڑی سلطنت کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہو جاتا ہے کہ یہ اکیلا انسان سلطنتِ مصر کا تختہ اُلٹ دے گا اور شاہی خاندان کو حکمران طبقے سمیت مُلک کے اقتدار سے بے دخل کر دے گا؟ پھر یہ سیاسی انقلاب کا خطرہ آخر پیدا ابھی کیوں ہُوا جب کہ اس شخص نے صرف نبوّت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ ہی پیش کیا تھا

وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ

اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھیے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجیے کہ ہر ماہرِ فن جادوگر کو آپ کے

اور کسی قسم کی سیاسی گفتگو سرے سے چھیڑی ہی نہ تھی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعوائے نبوت اپنے اندر خود ہی یہ معنیٰ رکھتا تھا کہ وہ دراصل پورے نظامِ زندگی کو بحیثیتِ مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو ربّ العالمین کے نمایندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کُلّی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے، کیونکہ ربّ العالمین کا نمایندہ کبھی مطیع اور رعیت بن کر رہنے کے لیے نہیں آتا بلکہ مطاع اور راعی بننے ہی کے لیے آیا کرتا ہے، اور کسی کافر کے حقِ حکمرانی کو تسلیم کرلینا اس کی حیثیتِ رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی زبان سے رسالت کا دعویٰ سنتے ہی فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کے سامنے سیاسی و معاشی اور تمدّنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہوگیا۔ رہی یہ بات کہ حضرت موسیٰؑ کے اِس دعوے کو مصر کے دربارِ شاہی میں اتنی اہمیّت ہی کیوں دی گئی جب کہ ان کے ساتھ ایک بھائی کے سوا کوئی معاون و مددگار اور صرف ایک سانپ بن جانے والی لاٹھی اور ایک چمکنے والے ہاتھ کے سوا کوئی نشانِ ماموریّت نہ تھا؟ تو میرے نزدیک اس کے دو بڑے سبب ہیں: ایک یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت سے فرعون اور اس کے درباری خوب واقف تھے۔ ان کی پاکیزہ اور مضبوط سیرت، ان کی غیر معمولی قابلیت، اور قیادت و فرماں روائی کی پیدایشی صلاحیّت کا سب کو علم تھا۔ تلمود اور یوسیفوس کی روایات اگر صحیح ہیں تو حضرت موسیٰؑ نے اِن پیدایشی قابلیتوں کے علاوہ فرعون کے ہاں عُلوم و فنون اور حکمرانی و سپہ سالاری کی وہ پوری تعلیم و تربیَت بھی حاصل کی تھی جو شاہی خاندان کے افراد کو دی جاتی تھی۔ اور زمانہٴ شاہزادگی میں حَبَش کی مہم پر جا کر وہ اپنے آپ کو ایک بہترین جنرل بھی ثابت کرچکے تھے۔ پھر جو تھوڑی بہت کمزوریاں شاہی محلوں میں پرورش پانے اور فرعونی نظام کے اندر امارت کے مناصب پر سرفراز رہنے کی وجہ سے ان میں پائی جاتی تھیں، وہ بھی آٹھ دس سال مَدیَن کے علاقے میں صحرائی زندگی گزارنے اور بکریاں چَرانے کی بدولت دُور ہو چکی تھیں، اور اب فرعونی دربار کے سامنے ایک ایسا سِن رسیدہ و سنجیدہ فقیر کِشوَر گیر نبوت کا دعویٰ لیے ہوئے کھڑا تھا جس کی بات کو بہرحال بادِ ہوائی سمجھ کر اُڑا یا نہ جا سکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عصا اور یدِ بیضا کی نشانیاں دیکھ کر فرعون اور اس کے درباری سخت مرعوب ہو چکے تھے اور ان کو تقریباً یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ شخص فی الواقع کوئی فوق الفطری طاقت اپنی پشت پر رکھتا ہے۔ ان کا حضرت موسیٰؑ کو ایک طرف جادوگر بھی کہنا اور پھر دوسری طرف یہ اندیشہ بھی ظاہر کرنا کہ یہ ہم کو اس سرزمین کی فرماں روائی سے بے دخل کرنا چاہتا ہے، ایک صریح تضادِ بیان تھا اور اُس بوکھلاہٹ کا ثبوت تھا جو اُن پر نبوت کے اس اوّلین مظاہرے سے طاری ہو گئی تھی۔ اگر حقیقت میں وہ حضرت موسیٰؑ کو جادوگر سمجھتے تو ہرگز ان سے کسی سیاسی انقلاب کا اندیشہ نہ کرتے۔ کیونکہ جادو کے بل بُوتے پر کبھی دنیا میں کوئی سیاسی انقلاب نہیں ہُوا ہے۔

عَلِيۡمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرۡعَوۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ لَنَا لَاَجۡرًا اِنۡ كُنَّا نَحۡنُ الۡغٰلِبِيۡنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمۡ وَ اِنَّكُمۡ لَمِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوۡا يٰمُوۡسٰۤى اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِىَ وَ اِمَّاۤ اَنۡ نَّكُوۡنَ نَحۡنُ الۡمُلۡقِيۡنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلۡقُوۡا ۚ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا سَحَرُوۡۤا اَعۡيُنَ النَّاسِ وَاسۡتَرۡهَبُوۡهُمۡ وَجَآءُوۡ بِسِحۡرٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰۤى اَنۡ اَلۡقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ

پاس لے آئیں۔[89] چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آ گئے۔

اُنھوں نے کہا: ’’اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟‘‘

فرعون نے جواب دیا: ’’ہاں، اور تم مقرّبِ بارگاہ ہو گے۔‘‘

پھر اُنھوں نے موسیٰؑ سے کہا: ’’تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟‘‘

موسیٰؑ نے جواب دیا: ’’تم ہی پھینکو۔‘‘

انھوں نے جو اپنے اَنچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے۔

ہم نے موسیٰؑ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔ اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے

---

۸۹ – فرعونی درباریوں کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں خدائی نشان اور جادو کے امتیازی فرق کا تصوّر بالکل واضح طور پر موجود تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خدائی نشان سے حقیقی تغیّر واقع ہوتا ہے اور جادو محض نظر اور نفس کو مُتأثّر کر کے اشیا میں ایک خاص طرح کا تغیر محسوس کراتا ہے۔ اسی بنا پر انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے دعوائے رسالت کو ردّ کرنے کے لیے کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے، یعنی عصا حقیقت میں سانپ نہیں بن گیا کہ اسے خدائی نشان مانا جائے، بلکہ صرف ہمیں ایسا نظر آیا کہ وہ گویا سانپ تھا، جیسا کہ ہر جادوگر کر لیتا ہے۔ پھر انھوں نے مشورہ دیا کہ تمام ملک کے ماہر جادوگروں کو بُلایا جائے اور ان کے ذریعے سے لاٹھیوں اور رسّیوں کو سانپوں میں تبدیل کر کے لوگوں کو دکھا دیا جائے، تا کہ عامّۃ النّاس کے دلوں میں اس پیغمبرانہ معجزے سے جو ہیبت بیٹھ گئی ہے وہ اگر بالکُلّیّہ دُور نہ ہو تو کم از کم شک ہی میں تبدیل ہو جائے۔

تَلۡقَفُ مَا يَاۡفِكُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الۡحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوۡا هُنَالِكَ وَانۡقَلَبُوۡا صٰغِرِيۡنَ ﴿۱۱۹﴾ وَاُلۡقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيۡنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرۡعَوۡنُ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَكُمۡ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكۡرٌ مَّكَرۡتُمُوۡهُ فِى الۡمَدِيۡنَةِ لِتُخۡرِجُوۡا مِنۡهَاۤ اَهۡلَهَا ۚ

اس جھوٹے طِلسم کو نگلتا چلا گیا۔[90]

اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ انھوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ فرعون اور اس کے ساتھی میدانِ مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور (فتح مند ہونے کے بجائے) اُلٹے ذلیل ہو گئے۔ اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انھیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے: ''ہم نے مان لیا ربّ العالمین کو، اُس رب کو جسے موسیٰؑ اور ہارونؑ مانتے ہیں۔''[91]

فرعون نے کہا: ''تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دوں؟ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اِس دارالسلطنت میں کی تا کہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو۔

---

۹۰ — یہ گمان کرنا صحیح نہیں ہے کہ عصا ان لاٹھیوں اور رسّیوں کو نگل گیا جو جادوگروں نے پھینکی تھیں اور سانپ اور اژدہے بنی نظر آ رہی تھیں۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ عصا نے سانپ بن کر اُن کے اُس طِلسمِ فریب کو نگلنا شروع کر دیا جو انھوں نے تیار کیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سانپ جدھر جدھر گیا وہاں سے جادُو کا وہ اثر کافور ہوتا چلا گیا جس کی بدولت لاٹھیاں اور رسّیاں سانپوں کی طرح لہراتی نظر آتی تھیں، اور اس کی ایک ہی گردش میں جادوگروں کی ہر لاٹھی، لاٹھی اور ہر رسّی، رسّی بن کر رہ گئی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: طٰہٰ، حاشیہ ۴۲)

۹۱ — اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کی چال کو اُلٹا انھی پر پلٹ دیا۔ انھوں نے تمام ملک کے ماہر جادوگروں کو بُلا کر منظرِ عام پر اس لیے مظاہرہ کرایا تھا کہ عوام الناس کو حضرت موسیٰؑ کے جادوگر ہونے کا یقین دلائیں، یا کم از کم شک ہی میں ڈال دیں۔ لیکن اس مقابلے میں شکست کھانے کے بعد خود اُن کے اپنے بُلائے ہوئے ماہرینِ فن نے بالاتفاق فیصلہ کر دیا کہ حضرت موسیٰؑ جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ ہرگز جادو نہیں ہے بلکہ یقیناً ربّ العالمین کی طاقت کا کرشمہ ہے جس کے آگے کسی جادو کا زور نہیں چل سکتا۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمھیں معلوم ہُوا جاتا ہے۔ میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سُولی پر چڑھاؤں گا۔''

انھوں نے جواب دیا: ''بہر حال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔ تُو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انھیں مان لیا۔ اَے رب! ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اُٹھا تو اِس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں۔[92]''ع

ظاہر ہے کہ جادو کو خود جادوگروں سے بڑھ کر اَور کون جان سکتا تھا۔ پس جب انھوں نے عملی تجربے اور آزمایش کے بعد شہادت دے دی کہ یہ چیز جادو نہیں ہے، تو پھر فرعون اور اس کے درباریوں کے لیے باشندگانِ ملک کو یہ یقین دلانا بالکل ناممکن ہوگیا کہ موسیٰؑ محض ایک جادوگر ہے۔

۹۲ - فرعون نے پانسا پلٹتے دیکھ کر آخری چال یہ چلی تھی کہ اس سارے معاملے کو موسیٰؑ اور جادوگروں کی سازش قرار دے دے اور پھر جادوگروں کو جسمانی عذاب اور قتل کی دھمکی دے کر ان سے اپنے اِس الزام کا اقبال کرالے۔ لیکن یہ چال بھی اُلٹی پڑی۔ جادوگروں نے اپنے آپ کو ہر سزا کے لیے پیش کر کے ثابت کر دیا کہ اُن کا موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر ایمان لانا کسی سازش کا نہیں بلکہ سچے اعترافِ حق کا نتیجہ تھا۔ اب اُس کے لیے کوئی چارۂ کار اس کے سوا باقی نہ رہا کہ حق اور انصاف کا ڈھونگ جو وہ رچانا چاہتا تھا، اسے چھوڑ کر صاف صاف ظلم وستم شروع کر دے۔

اس مقام پر یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ چند لمحوں کے اندر ایمان نے ان جادوگروں کی سیرت میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انھی جادوگروں کی دناءت کا یہ حال تھا کہ اپنے دینِ آبائی کی نصرت وحمایت کے لیے گھروں سے چل کر آئے تھے اور فرعون سے پوچھ رہے تھے کہ اگر ہم نے اپنے مذہب کو موسیٰؑ کے حملے سے بچا لیا تو سرکار سے ہمیں انعام تو

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰی رَبُّكُمْ

فرعون سے اُس کی قوم کے سرداروں نے کہا: ”کیا تُو موسیٰؑ اور اس کی قوم کو یونہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبُودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے؟“ فرعون نے جواب دیا: ”میں اُن کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور اُن کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔[۹۳] ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔“

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: ”اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور آخری کامیابی انھی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔“ اس کی قوم کے لوگوں نے کہا: ”تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جا رہے ہیں۔“ اس نے جواب دیا: ”قریب ہے وہ وقت کہ تمھارا رب

ملے گا نا؟ یا اب جو نعمتِ ایمان نصیب ہوئی تو انھی کی حق پرستی اور اُولُوا العزمی اس حد کو پہنچ گئی کہ تھوڑی دیر پہلے جس بادشاہ کے آگے لالچ کے مارے بچھے جا رہے تھے اب اس کی کبریائی اور اس کے جَبَرُوت کو ٹھوکر مار رہے ہیں اور ان بدترین سزاؤں کو بھگتنے کے لیے تیار ہیں جن کی دھمکی وہ دے رہا ہے، مگر اس حق کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس کی صداقت ان پر کُھل چکی ہے۔

۹۳ - واضح رہے کہ ایک دَورِ ستم وہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کی پیدایش سے پہلے رعمسیس ثانی کے زمانے میں جاری ہُوا تھا، اور دوسرا دورِ ستم یہ ہے جو حضرت موسیٰؑ کی بِعثَت کے بعد شروع ہوا۔ دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل

أَنۡ يُّهۡلِكَ عَدُوَّكُمۡ وَيَسۡتَخۡلِفَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرَ كَيۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ۝١٢٩ ع وَلَقَدۡ اَخَذۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ بِالسِّنِيۡنَ وَنَقۡصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَذَّكَّرُوۡنَ ۝١٣٠ فَاِذَا جَآءَتۡهُمُ الۡحَسَنَةُ قَالُوۡا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوۡا بِمُوۡسٰى وَمَنۡ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰۤئِرُهُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝١٣١ وَقَالُوۡا مَهۡمَا تَاۡتِنَا بِهٖ مِنۡ اٰيَةٍ لِّتَسۡحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۝١٣٢

تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔" ع

ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے۔ مگر اُن کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اِسی کے مستحق ہیں، اور جب بُرا زمانہ آتا تو موسیٰؑ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لیے فالِ بد ٹھیراتے، حالانکہ درحقیقت ان کی فالِ بد تو اللہ کے پاس تھی، مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔ انھوں نے موسیٰؑ سے کہا کہ "تو ہمیں مسحور کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آئے، ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں ہیں[۹۴]۔"

کرایا گیا اور ان کی بیٹیوں کو جیتا چھوڑ دیا گیا، تاکہ بتدریج ان کی نسل کا خاتمہ ہو جائے اور یہ قوم دوسری قوموں میں گم ہو کر رہ جائے۔ غالباً اسی دَور کا ہے وہ کتبہ جو ۱۸۹۶ء میں قدیم مصری آثار کی کُھدائی کے دوران میں ملا تھا، اور جس میں یہی فرعون منفتاح اپنے کارناموں اور فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "اور اسرائیل کو مٹا دیا گیا، اس کا بیج تک باقی نہیں"۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: المومن، آیت ۲۵)

۹۴ – یہ انتہائی ہٹ دھرمی و سُخن پروری تھی کہ فرعون کے اہلِ دربار اُس چیز کو بھی جادو قرار دے رہے تھے جس کے متعلق وہ خود بھی بالیقین جانتے تھے کہ وہ جادو کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ شاید کوئی بے وقوف آدمی بھی یہ باور نہ کرے گا کہ ایک پورے ملک میں قحط پڑ جانا اور زمین کی پیداوار میں مسلسل کمی واقع ہونا کسی جادو کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر قرآنِ مجید کہتا ہے کہ فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ اٰيٰتُنَا مُبۡصِرَةً قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۝ وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا (النمل، آیات ۱۳–۱۴) یعنی "جب ہماری نشانیاں عَلانیہ اُن کی نگاہوں کے سامنے آئیں تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے، حالانکہ ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے، مگر انھوں نے محض ظلم اور سرکشی کی راہ سے ان کا انکار کیا۔"

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰۤى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

آخرِ کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا،[95] ٹڈی دَل چھوڑے، سُرسُریاں[96] پھیلائیں، مینڈک نکالے، اور خون برسایا، یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں، مگر وہ سرکشی کیے چلے گئے، اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔ جب کبھی اُن پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے: ”اے موسیٰؑ! تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر ہمارے حق میں دعا کر، اگر اب کے تُو ہم پر سے یہ بلا ٹلوا دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔“ مگر جب ہم ان پر سے اپنا عذاب ایک وقتِ مقرر تک کے لیے، جس کو وہ بہرحال پہنچنے والے تھے، ہٹا لیتے تو وہ یکلخت اپنے عہد سے پھر جاتے۔ تب ہم نے اُن سے انتقام لیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا، کیونکہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جُھٹلایا تھا اور اُن سے بے پروا ہو گئے تھے۔

۹۵- غالباً بارش کا طوفان مراد ہے جس میں اولے بھی برسے تھے۔ اگرچہ طوفان دوسری چیزوں کا بھی ہو سکتا ہے، لیکن بائبل میں ژالہ باری کے طوفان کا ہی ذکر ہے [خُروج، باب ۹، آیت ۲۳] اس لیے ہم اسی معنیٰ کو ترجیح دیتے ہیں۔

۹۶- اصل میں لفظ قُمَّل استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنیٰ ہیں۔ جُوں، چھوٹی مکھی، چھوٹی ٹڈی، مچھّر، سُرسُری وغیرہ۔ غالباً یہ جامع لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ بیک وقت جُوؤں اور مچھروں نے آدمیوں پر اور سُرسُریوں (گُھن کے کیڑوں) نے غلّے کے ذخیروں پر حملہ کیا ہوگا۔ (تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل کی کتاب خُروج، باب ۷ تا ۱۲۔ نیز الزُّخرُف، حاشیہ ۴۳)

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ

اور اُن کی جگہ ہم نے اُن لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، اُس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔[97] اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہُوا، کیونکہ اُنھوں نے صبر سے کام لیا تھا اور فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا گیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے۔

بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گزار دیا، پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر اُن کا گزر ہُوا جو اپنے چند بُتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے: ”اے موسیٰؑ! ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے اِن لوگوں کے معبُود ہیں۔“[98]

۹۷ – یعنی بنی اسرائیل کو فلسطین کی سرزمین کا وارث بنا دیا۔ بعض لوگوں نے اس کا مفہُوم یہ لیا ہے کہ بنی اسرائیل خود سرزمینِ مصر کے مالک بنا دیے گئے۔ لیکن اس معنیٰ کو تسلیم کرنے کے لیے نہ تو قرآنِ کریم کے اشارات کافی واضح ہیں اور نہ تاریخ و آثار ہی سے اس کی کوئی قوی شہادت ملتی ہے، اس لیے اس معنیٰ کو تسلیم کرنے میں ہمیں تأمّل ہے۔ (مُلاحظہ ہو: الکہف، حاشیہ ۵۷۔ الشُّعَراء، حاشیہ ۴۵)

۹۸ – بنی اسرائیل نے جس مَقام سے بحرِ احمر کو عبور کیا وہ غالباً موجودہ سویز اور اسماعیلیہ کے درمیان کوئی مَقام تھا۔ یہاں سے گزر کر یہ لوگ جزیرہ نُمائے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف ساحل کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔ اُس زمانے میں جزیرہ نمائے سینا کا مغربی اور شمالی حصّہ مصر کی سلطنت میں شامل تھا۔ جنوب کے علاقے میں موجودہ شہر طُور اور ابوزَنِیمہ کے درمیان تانبے اور فیروزے کی کانیں تھیں جن سے اہلِ مصر بہت فائدہ اُٹھاتے تھے اور ان کانوں کی حفاظت کے لیے مصریوں نے چند مَقامات پر

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَ

موسیٰؑ نے کہا: ”تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ لوگ جس طریقے کی پیروی کر رہے ہیں وہ تو برباد ہونے والا ہے، اور جو عمل وہ کر رہے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔“ پھر موسیٰؑ نے کہا: ”کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبُود تمھارے لیے تلاش کروں؟ حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔ اور (اللہ فرماتا ہے)

چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انھی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی مَفْقَہ کے مقام پر تھی، جہاں مصریوں کا ایک بہت بڑا بُت خانہ تھا جس کے آثار اب بھی جزیرہ نما کے جنوبی مغربی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے قریب ایک اور مقام بھی تھا جہاں قدیم زمانے سے سامی قوموں کی چاند دیوی کا بت خانہ تھا۔ غالبًا اِنھی مقامات میں سے کسی کے پاس سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل کو، جن پر مصریوں کی غلامی نے مصریت زدگی کا اچھا خاصا گہرا ٹھپّا لگا رکھا تھا، ایک مصنوعی خدا کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔

بنی اسرائیل کی ذہنیّت کو اہلِ مصر کی غلامی نے جیسا کچھ بگاڑ دیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ مصر سے نکل آنے کے ۴۰ برس بعد حضرت موسیٰؑ کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشَعؑ بن نُون اپنی آخری تقریر میں بنی اسرائیل کے مجمعِ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ”پس اب تم خداوند کا خوف رکھو اور نیک نیتی اور صداقت سے اُس کی پرستش کرو اور اُن دیوتاؤں کو دُور کر دو جن کی پرستش تمھارے باپ دادا بڑے دریا کے پار اور مصر میں کرتے تھے، اور خداوند کی پرستش کرو۔ اور اگر خداوند کی پرستش تم کو بُری معلوم ہوتی ہو تو آج ہی تم اُسے جس کی پرستش کروگے، چُن لو...... اب رہی میری اور میرے گھرانے کی بات، سو ہم تو خداوند کی پرستش کریں گے۔“ (یشُوع ۲۴: ۱۴-۱۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴۰ سال تک حضرت موسیٰؑ کی اور ۲۸ سال تک حضرت یُوشَعؑ کی تربیّت و رہنمائی میں زندگی بسر کر لینے کے بعد بھی یہ قوم اپنے اندر سے اُن اثرات کو نہ نکال سکی جو فراعنۂ مصر کی بندگی کے دَور میں اُس کی رگ رگ کے اندر اُتر گئے تھے۔ پھر بھلا کیونکر ممکن تھا کہ مصر سے نکلنے کے بعد فوراً ہی جو بُت کدہ سامنے آ گیا تھا، اس کو دیکھ کر ان بگڑے ہوئے مسلمانوں میں سے بہتوں کی پیشانیاں اُس آستانے پر سجدہ کرنے کے لیے بے تاب نہ ہو جاتیں جس پر وہ اپنے سابق آقاؤں کو ماتھا رگڑتے ہوئے دیکھ چکے تھے۔

اِذْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ع وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ۚ وَ قَالَ

وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرعون والوں سے تمھیں نجات دی، جن کا حال یہ تھا کہ تمھیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے، تمھارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے، اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمایش تھی۔“ ع

ہم نے موسیٰؑ کو تیس شب و روز کے لیے (کوہِ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا، اِس طرح اُس کے رب کی مقرر کردہ مدّت پورے چالیس دن ہوگئی۔[99] موسیٰؑ نے چلتے ہوئے اپنے

۹۹- مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل کی غلامانہ پابندیاں ختم ہوگئیں اور اُنھیں ایک خود مختار قوم کی حیثیّت حاصل ہوگئی تو حکمِ خداوندی کے تحت حضرت موسیٰؑ کوہِ سینا پر طلب کیے گئے تاکہ انھیں بنی اسرائیل کے لیے شریعت عطا فرمائی جائے۔ چنانچہ یہ طلبی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، اس سلسلے کی پہلی طلبی تھی، اور اس کے لیے چالیس دن کی میعاد اس لیے مقرر کی گئی تھی کہ حضرت موسیٰؑ ایک پورا چلّہ پہاڑ پر گزاریں اور روزے رکھ کر، شب و روز عبادت اور تفکّر و تدبّر کرکے اور دل و دماغ کو یکسو کرکے اُس قولِ ثقیل کے اخذ کرنے کی استعداد اپنے اندر پیدا کریں جو ان پر نازل کیا جانے والا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ارشاد کی تعمیل میں کوہِ سینا جاتے وقت بنی اسرائیل کو اُس مقام پر چھوڑا تھا جو موجودہ نقشے میں نبی صالح اور کوہِ سینا کے درمیان وادی الشیخ کے نام سے موسوم ہے۔ اس وادی کا وہ حصہ جہاں بنی اسرائیل نے پڑاؤ کیا تھا آج کل میدان الراحہ کہلاتا ہے۔ وادی کے ایک سرے پر وہ پہاڑی واقع ہے جہاں مقامی روایت کے بموجب حضرت صالحؑ ثمود کے علاقے سے ہجرت کرکے تشریف لے آئے تھے۔ آج وہاں ان کی یادگار میں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک اور پہاڑی جبلِ ہارون نامی ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے ناراض ہوکر جا بیٹھے تھے۔ تیسری طرف سینا کا بلند پہاڑ ہے جس کا بالائی حصہ اکثر بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے اور جس کی بلندی ۷۳۵۹ فٹ ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر آج تک وہ کھوہ زیارت گاہِ عام بنی ہوئی ہے جہاں حضرت موسیٰؑ نے چلّہ کیا تھا۔

مُوسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ

بھائی ہارونؑ سے کہا کہ "میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔[100]" جب وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ "اے رب! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔" فرمایا: "تُو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں، ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا۔" چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلّی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا: "پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔" فرمایا: "اے موسیٰؑ! میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے

اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد اور عیسائیوں کا ایک گرجا موجود ہے اور پہاڑ کے دامن میں رومی قیصر جَسٹینین کے زمانے کی ایک خانقاہ آج تک موجود ہے۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: النمل، حواشی ۹-۱۰)

۱۰۰ – حضرت ہارون علیہ السلام اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے لیکن کارِ نبوت میں حضرت موسیٰؑ کے ماتحت اور مددگار تھے۔ ان کی نبوّت مستقل نہ تھی بلکہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کر کے ان کو اپنے وزیر کی حیثیّت سے مانگا تھا، جیسا کہ آگے چل کر قرآنِ مجید میں بتصریح بیان ہُوا ہے۔

بِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا

اور مجھ سے ہم کلام ہو۔ پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجا لا۔“

اس کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو ہر شعبۂ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دے دی[101] اور اس سے کہا:

”اِن ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں[102]۔ عنقریب میں تمھیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا[103]۔ میں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں[104]، وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان

۱۰۱ – بائبل میں تصریح ہے کہ یہ دونوں تختیاں پتھر کی سلیں تھیں، اور ان تختیوں پر لکھنے کا فعل بائبل اور قرآن دونوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم اس بات کا تعیُّن کر سکیں کہ آیا ان تختیوں پر کتابت کا کام اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنی قدرت سے کیا تھا، یا کسی فرشتے سے یہ خدمت لی تھی، یا خود حضرت موسیٰؑ کا ہاتھ استعمال فرمایا تھا۔ (تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل، کتابِ خُروج، باب ۳۱، آیت ۱۸۔ باب ۳۲، آیت ۱۵-۱۶- واِستِثنا، باب ۵، آیت ۶-۲۲)

۱۰۲ – یعنی احکامِ الٰہی کا وہ صاف اور سیدھا مفہوم لیں جو عقلِ عام سے ہر وہ شخص سمجھ لے گا جس کی نیت میں فساد، یا جس کے دل میں ٹیڑھ نہ ہو۔ یہ قید اس لیے لگائی گئی کہ جو لوگ احکام کے سیدھے سادھے الفاظ میں سے قانونی اینچ پینچ اور حیلوں کے راستے اور فتنوں کی گنجایشیں نکالتے ہیں، کہیں ان کی مُوشگافیوں کو کتاب اللہ کی پیروی نہ سمجھ لیا جائے۔

۱۰۳ – یعنی آگے چل کر تم لوگ اُن قوموں کے آثارِ قدیمہ پر سے گزرو گے جنھوں نے خدا کی بندگی و اطاعت سے منہ موڑا اور غلط روی پر اصرار کیا۔ ان آثار کو دیکھ کر تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ ایسی رَوِش اختیار کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔

بِهَا ۚ وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿١٤٦﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٧﴾ ع

نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ اُن کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے، اس لیے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروائی کرتے رہے۔ ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا اور آخرت کی پیشی کا اِنکار کیا، اُس کے سارے اعمال ضائع[105] ہو گئے۔ کیا لوگ اِس کے سوا کچھ اَور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں؟" ع

١٠٤- یعنی میرا قانونِ فطرت یہی ہے کہ ایسے لوگ کسی عبرت ناک چیز سے عبرت اور کسی سبق آموز شے سے سبق حاصل نہیں کر سکتے۔

"بڑا بننا" یا "تکبّر کرنا" قرآنِ مجید اس معنیٰ میں استعمال کرتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بندگی کے مقام سے بالاتر سمجھنے لگے اور خدا کے احکام کی کچھ پروا نہ کرے، اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرے گویا کہ وہ نہ خدا کا بندہ ہے اور نہ خدا اس کا رب ہے۔ اس خودسری کی کوئی حقیقت ایک پندارِ غلط کے سوا نہیں ہے، کیونکہ خدا کی زمین میں رہتے ہوئے ایک بندے کو کسی طرح یہ حق پہنچتا ہی نہیں کہ غیر کا بندہ بن کر رہے۔ اسی لیے فرمایا کہ "وہ بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔"

١٠٥- ضائع ہو گئے، یعنی بار آور نہ ہوئے، غیر مفید اور لاحاصل نکلے۔ اس لیے کہ خدا کے ہاں انسانی سعی و عمل کے بار آور ہونے کا انحصار بالکل دو اُمور پر ہے: ایک یہ کہ وہ سعی و عمل خدا کے قانونِ شرعی کی پابندی میں ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سعی و عمل میں دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابی پیشِ نظر ہو۔ یہ دو شرطیں جہاں پوری نہ ہوں گی، وہاں لازماً حبطِ عمل واقع ہوگا۔ جس نے خدا سے ہدایت لیے بغیر بلکہ اس سے منہ موڑ کر باغیانہ انداز پر دنیا میں کام کیا، ظاہر ہے کہ وہ خدا سے کسی اجر کی توقع رکھنے کا کسی طرح حق دار نہیں ہو سکتا۔ اور جس نے سب کچھ دنیا ہی کے لیے کیا، اور آخرت کے لیے کچھ نہ کیا، کھلی بات ہے کہ آخرت میں اسے کوئی ثمرہ پانے کی اُمید نہ رکھنی چاہیے، اور کوئی وجہ نہیں کہ وہاں وہ کسی قسم کا ثمرہ پائے۔ اگر میری مملوکہ زمین میں کوئی شخص میرے منشا کے خلاف تصرّف کرتا رہا ہے تو وہ مجھ سے سزا پانے کے سوا آخر اور کیا پانے کا حق دار ہو سکتا ہے؟ اور اگر اس زمین پر اپنے غاصبانہ قبضے کے زمانے میں اس نے سارا کام خود ہی اس ارادے کے ساتھ کیا ہو کہ جب تک اصل مالک اس کی جرأتِ بے جا سے اِغماض کر رہا ہے،

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ

وقف لازم

موسیٰؑ کے پیچھے[۱۰۶] اس کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا پُتلا بنا لیا جس میں سے بَیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا اُنھیں نظر نہ آتا تھا کہ وہ نہ ان سے بولتا ہے نہ کسی معاملے میں ان کی رہنمائی کرتا ہے؟ مگر پھر بھی انھوں نے اسے معبُود بنا لیا[۱۰۷] اور وہ سخت ظالم تھے۔ پھر جب ان کی فریب خوردگی کا طِلِسم ٹوٹ گیا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ درحقیقت وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ "اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگزر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔" اُدھر سے موسیٰؑ غصّے اور رنج میں بھرا ہُوا اپنی قوم کی

اسی وقت تک وہ اس سے فائدہ اُٹھائے گا اور مالک کے قبضے میں زمین واپس چلے جانے کے بعد وہ خود بھی کسی فائدے کا متوقع یا طالب نہیں ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ میں اس غاصب سے اپنی زمین واپس لینے کے بعد زمین کی پیداوار میں سے کوئی حصّہ خواہ مخواہ اسے دوں؟

۱۰۶ – یعنی اُن چالیس دنوں کے دوران میں جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طلبی پر کوہِ سینا گئے ہوئے تھے اور یہ قوم پہاڑ کے نیچے میدانُ الرَّاحہ میں ٹھیری ہوئی تھی۔

۱۰۷ – یہ اُس مصریّت زدگی کا دوسرا ظہور تھا جسے لیے ہوئے بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے۔ مصر میں گائے کی پرستش اور تقدیس کا جو رواج تھا، اس سے یہ قوم اتنی شدّت کے ساتھ متاثّر ہو چکی تھی کہ قرآن کہتا ہے: وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ یعنی ان کے دلوں میں بچھڑا بس کر رہ گیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ ابھی مصر سے نکلے ہوئے ان کو صرف تین مہینے ہی گزرے تھے۔ سمندر کا پھٹنا، فرعون کا غرق ہونا، اِن لوگوں کا بخیریت اُس بندِ غلامی سے نکل آنا جس کے ٹوٹنے کی کوئی اُمید نہ تھی، اور اس سلسلے کے دوسرے واقعات ابھی بالکل تازہ تھے، اور انھیں خوب معلوم تھا کہ یہ جو کچھ ہُوا، محض اللہ کی قدرت سے ہُوا ہے، کسی دوسرے کی طاقت و تصرّف کا اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ مگر اس پر بھی انھوں نے پہلے تو پیغمبرؑ سے ایک مصنوعی خدا طلب کیا، اور پھر پیغمبرؑ کے پیٹھ موڑتے ہی خود ایک مصنوعی خدا بنا ڈالا۔ یہی وہ حرکت ہے جس پر بعض انبیائے بنی اسرائیل نے اپنی قوم کو اُس بدکار عورت

غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

طرف پلٹا۔ آتے ہی اس نے کہا: ”بہت بُری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد! کیا تم سے اتنا صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے؟“ اور تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی (ہارونؑ) کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا۔ ہارونؑ نے کہا: ”اے میری ماں کے بیٹے! اِن لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔ پس تُو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اِس ظالم گروہ کے ساتھ مجھے نہ شامل کر۔“[۱۰۸]

سے تشبیہ دی ہے جو اپنے شوہر کے سوا ہر دوسرے مرد سے دل لگاتی ہو اور جو شبِ اوّل میں بھی بے وفائی سے نہ چُوکی ہو۔

۱۰۸- یہاں قرآنِ مجید نے ایک بہت بڑے الزام سے حضرت ہارونؑ کی بَراءت ثابت کی ہے جو یہودیوں نے زبردستی اُن پر چسپاں کر رکھا تھا۔ بائبل میں بچھڑے کی پرستش کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کو پہاڑ سے اُترنے میں دیر لگی تو بنی اسرائیل نے بے صبر ہو کر حضرت ہارونؑ سے کہا کہ ہمارے لیے ایک معبُود بنا دو، اور حضرت ہارونؑ نے ان کی فرمایش کے مطابق سونے کا ایک بچھڑا بنا دیا، جسے دیکھتے ہی بنی اسرائیل پکار اُٹھے کہ اے اسرائیل! یہی تیرا وہ خدا ہے جو تجھے ملکِ مصر سے نکال کر لایا ہے۔ پھر حضرت ہارونؑ نے اس کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور اعلان کر کے دوسرے روز تمام بنی اسرائیل کو جمع کیا اور اس کے آگے قربانیاں چڑھائیں (خُروج، باب ۳۲، آیت ۱-۶)۔ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر بصراحت اس غلط بیانی کی تردید کی گئی ہے اور حقیقتِ واقعہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس جرمِ عظیم کا مرتکب خدا کا نبی ہارون نہیں بلکہ خدا کا باغی سامری تھا۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ طٰہٰ، آیات ۹۰-۹۴)

بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل جن لوگوں کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں، ان میں سے کسی کی سیرت کو بھی انھوں نے داغ دار کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے، اور داغ بھی ایسے سخت لگائے ہیں جو اخلاق و شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار ہوتے ہیں، مثلاً شرک، جادوگری، زِنا، جھوٹ، دغابازی اور ایسے ہی دوسرے شدید معاصی، جن سے آلودہ ہونا پیغمبر تو درکنار، ایک معمولی مومن اور شریف انسان کے لیے بھی سخت شرم ناک ہے۔ یہ بات بجائے خود نہایت عجیب ہے۔ لیکن بنی اسرائیل کی اخلاقی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فی الحقیقت اس قوم کے معاملے میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ قوم جب

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۱۵۱﴾ ع اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا ؗ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖۚ وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًی

ع ۱۸/۸

تب موسیٰؑ نے کہا: ”اے رب! مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تو سب سے بڑھ کر رحیم ہے۔“ ع (جواب میں ارشاد ہوا کہ) ”جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا، وہ ضرور اپنے رب کے غضب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلیل ہوں گے۔ جھوٹ گھڑنے والوں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ برے عمل کریں پھر توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں تو یقیناً اس توبہ و ایمان کے بعد تیرا رب درگزر اور رحم فرمانے والا ہے۔“

پھر جب موسیٰؑ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے وہ تختیاں اُٹھا لیں جن کی تحریر میں ہدایت

اخلاقی و مذہبی انحطاط میں مبتلا ہوئی اور عوام سے گزر کر ان کے خواص تک کو، حتّٰی کہ علما و مشائخ اور دینی منصب داروں کو بھی گمراہیوں اور بد اخلاقیوں کا سیلاب بہالے گیا تو اُن کے مجرم ضمیر نے اپنی اس حالت کے لیے عُذرات تراشنے شروع کیے، اور اسی سلسلے میں انھوں نے وہ تمام جرائم جو یہ خود کرتے تھے، انبیا علیہم السلام کی طرف منسوب کر ڈالے، تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب نبی تک ان چیزوں سے نہ بچ سکے تو بھلا اور کون بچ سکتا ہے۔ اس معاملے میں یہودیوں کا حال ہندوؤں سے ملتا جُلتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی جب اخلاقی انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تو وہ لٹریچر تیار ہوا جس میں دیوتاؤں کی، رشیوں، مُنیوں اور اوتاروں کی، غرض جو بلند ترین آئیڈیل قوم کے سامنے ہو سکتے تھے، اُن سب کی زندگیاں بد اخلاقی کے تارکول سے سیاہ کر ڈالی گئیں، تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب ایسی ایسی عظیم الشان ہستیاں ان قبائح میں مبتلا ہو سکتی ہیں تو بھلا ہم معمولی فانی انسان اِن میں مبتلا ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں، اور پھر جب یہ افعال اتنے اُونچے مرتبے والوں کے لیے بھی شرم ناک نہیں ہیں تو ہمارے لیے کیوں ہوں۔

وَّرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ هُمۡ لِرَبِّهِمۡ يَرۡهَبُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾ وَاخۡتَارَ مُوۡسٰى قَوۡمَهٗ سَبۡعِيۡنَ رَجُلًا لِّمِيۡقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ قَالَ رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَهۡلَكۡتَهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ وَاِيَّاىَ‌ ؕ اَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنۡ هِىَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَتَهۡدِىۡ مَنۡ تَشَآءُ‌ ؕ اَنۡتَ وَلِيُّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا‌ وَاَنۡتَ خَيۡرُ الۡغٰفِرِيۡنَ ﴿۱۵۵﴾

اور رحمت تھی اُن لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور اُس نے اپنی قوم کے ستّر آدمیوں کو منتخب کیا تاکہ وہ (اُس کے ساتھ) ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں[109]۔ جب اِن لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آ پکڑا تو موسیٰؑ نے عرض کیا: "اے میرے سرکار! آپ چاہتے تو پہلے ہی اِن کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ کیا آپ اس قصور میں، جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا، ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمایش تھی جس کے ذریعے سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں[110]۔ ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں۔ پس ہمیں معاف کر دیجیے اور ہم پر رحم فرمائیے، آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں۔

۱۰۹ – یہ طلبی اس غرض کے لیے ہوئی تھی کہ قوم کے ۷۰ نمایندے کوہِ سینا پر پیشیِ خداوندی میں حاضر ہو کر قوم کی طرف سے گوسالہ پرستی کے جرم کی معافی مانگیں اور از سرِ نو اطاعت کا عہد اُستوار کریں۔ بائبل اور تلمُود میں اس بات کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ یہ ذکر ہے کہ جو تختیاں حضرت موسیٰؑ نے پھینک کر توڑ دی تھیں، ان کے بدلے دوسری تختیاں عطا کرنے کے لیے آپ کو سینا پر بُلایا گیا تھا (خُروج، باب ۳۴)۔

۱۱۰ – مطلب یہ ہے کہ ہر آزمایش کا موقع انسانوں کے درمیان فیصلہ کُن ہوتا ہے۔ وہ چھاج کی طرح ایک مخلوط گروہ میں سے کار آمد آدمیوں اور ناکارہ آدمیوں کو پھٹک کر الگ کر دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا عین مُقتضا ہے کہ ایسے مواقع وقتاً فوقتاً آتے رہیں۔ ان مواقع پر جو کامیابی کی راہ پاتا ہے وہ اللہ ہی کی توفیق و رہنمائی سے پاتا ہے، اور جو ناکام ہوتا ہے وہ اُس کی توفیق و رہنمائی سے محروم ہونے کی بدولت ہی ناکام ہوتا ہے۔ اگرچہ اللہ کی طرف سے توفیق اور رہنمائی ملنے اور نہ ملنے کے لیے بھی ایک ضابطہ ہے جو سراسر حکمت اور عدل پر مبنی ہے لیکن بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت ہے کہ آدمی کا آزمایش کے

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۵۶ۚ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ

اور ہمارے لیے اِس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجیے اور آخرت کی بھی، ہم نے آپ کی طرف رُجوع کر لیا۔" جواب میں ارشاد ہوا: "سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں، مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے[111]، اور اُسے مَیں اُن لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے۔"

(پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصّہ ہے) جو اِس پیغمبرؐ، نبیِ اُمّی کی پیروی اختیار کریں[112] جس کا

مواقع پر کامیابی کی راہ پانا یا نہ پانا اللہ کی توفیق و ہدایت پر منحصر ہے۔

۱۱۱ – یعنی اللہ تعالیٰ جس طریقے پر خدائی کر رہا ہے اس میں اصل چیز غضب نہیں ہے جس میں کبھی کبھی رحم اور فضل کی شان نمودار ہو جاتی ہو، بلکہ اصل چیز رحم ہے جس پر سارا نظامِ عالَم قائم ہے، اور اس میں غضب صرف اس وقت نمودار ہوتا ہے جب بندوں کا تمرُّد حد سے فزوں ہو جاتا ہے۔

۱۱۲ – حضرت موسیٰؑ کی دعا کا جواب اُوپر کے فقرے پر ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اب موقع کی مناسبت سے فوراً بنی اسرائیل کو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع کی دعوت دی گئی ہے۔ تقریر کا مدّعا یہ ہے کہ تم پر خدا کی رحمت نازل ہونے کے لیے جو شرائط موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں عائد کی گئی تھیں وہی آج تک قائم ہیں، اور دراصل یہ اُنھی شرائط کا تقاضا ہے کہ تم اِس پیغمبرؐ پر ایمان لاؤ۔ تم سے کہا گیا تھا کہ خدا کی رحمت اُن لوگوں کا حصّہ ہے جو نافرمانی سے پرہیز کریں۔ تو آج سب سے بڑی بنیادی نافرمانی یہ ہے کہ جس پیغمبرؐ کو خدا نے مامور کیا ہے، اس کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے۔ لہٰذا جب تک اِس نافرمانی سے پرہیز نہ کرو گے، تقویٰ کی جڑ ہی سرے سے قائم نہ ہو گی، خواہ جُزئیات و فُروعات میں تم کتنا ہی تقویٰ بگھارتے رہو۔ تم سے کہا گیا تھا کہ رحمتِ الٰہی سے حصّہ پانے کے لیے زکوٰۃ بھی ایک شرط ہے۔ تو آج کسی اِنفاقِ مال پر اُس وقت تک زکوٰۃ کی تعریف صادق نہیں آ سکتی جب تک اِقامتِ دینِ حق کی اُس جِدّوجُہد کا ساتھ نہ دیا جائے جو اِس پیغمبرؐ کی قیادت میں ہو رہی ہے۔ لہٰذا جب تک اِس راہ میں مال صَرف نہ کرو گے،

يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ

ذکر اُنھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہُوا ملتا ہے[۱۱۳]۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے[۱۱۴]، اور ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے[۱۱۵]۔

زکوٰۃ کی بنیاد ہی اُستوار نہ ہوگی، چاہے تم کتنی ہی خیرات اور نذر و نیاز کرتے رہو۔ تم سے کہا گیا تھا کہ اللہ نے اپنی رحمت صرف اُن لوگوں کے لیے لکھی ہے جو اللہ کی آیات پر ایمان لائیں۔ تو آج جو آیات اس پیغمبر پر نازل ہو رہی ہیں، ان کا انکار کر کے تم کسی طرح بھی آیاتِ الٰہی کے ماننے والے قرار نہیں پا سکتے۔ لہٰذا جب تک اِن پر ایمان نہ لاؤ گے یہ آخری شرط بھی پوری نہ ہوگی، خواہ تورات پر ایمان رکھنے کا تم کتنا ہی دعویٰ کرتے رہو۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ”اُمّی“ کا لفظ بہت معنیٰ خیز استعمال ہُوا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے سوا دوسری قوموں کو اُمّی (gentiles) کہتے تھے اور ان کا قومی فخر و غرور کسی اُمّی کی پیشوائی تسلیم کرنا تو درکنار، اِس پر بھی تیار نہ تھا کہ اُمّیوں کے لیے اپنے برابر انسانی حُقوق ہی تسلیم کر لیں۔ چنانچہ قرآن ہی میں آتا ہے کہ وہ کہتے تھے: لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ (آلِ عمران، آیت ۷۵) ”اُمّیوں کے مال مار کھانے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔“ پس اللہ تعالیٰ انھی کی اصطلاح استعمال کر کے فرماتا ہے کہ اب تو اِسی اُمّی کے ساتھ تمھاری قسمت وابستہ ہے، اس کی پیروی قبول کرو گے تو میری رحمت سے حصّہ پاؤ گے، ورنہ وہی غضب تمھارے لیے مقدر ہے جس میں صدیوں سے گرفتار چلے آ رہے ہو۔

۱۱۳ – مثال کے طور پر تورات اور انجیل کے حسبِ ذیل مقامات مُلاحظہ ہوں جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق صاف اشارات موجود ہیں: اِستِثنا، باب ۱۸، آیت ۱۵ تا ۱۹۔ مَتّی، باب ۲۱، آیت ۳۳ تا ۴۶۔ یُوحنّا، باب ۱، آیت ۱۹ تا ۲۱۔ یُوحنّا، باب ۱۴، آیت ۱۵ تا ۱۷ اور آیت ۲۵ تا ۳۰۔ یُوحنّا، باب ۱۵، آیت ۲۵ – ۲۶۔ یُوحنّا، باب ۱۶، آیت ۷ تا ۱۵۔

۱۱۴ – یعنی جن پاک چیزوں کو انھوں نے حرام کر رکھا ہے، وہ انھیں حلال قرار دیتا ہے، اور جن ناپاک چیزوں کو یہ لوگ حلال کیے بیٹھے ہیں، انھیں وہ حرام قرار دیتا ہے۔

۱۱۵ – یعنی ان کے فقیہوں نے اپنی قانونی مُوشگافیوں سے، ان کے روحانی مقتداؤں نے اپنے تورُّع کے مبالغوں سے، اور ان کے جاہل عوام نے اپنے توہُّمات اور خود ساختہ حُدود و ضوابط سے ان کی زندگی کو جن بوجھوں تلے دبا رکھا ہے اور جن

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

لٰہذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ؑ اے محمدؐ! کہو کہ ”اے انسانو! مَیں تم سب کی طرف اُس خدا کا پیغمبرؐ ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اُس کے سِوا کوئی خدا نہیں ہے، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبیِ اُمّی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اُس کی، اُمّید ہے کہ تم راہِ راست پالو گے۔“[116]

موسیٰؑ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حق کے مطابق ہدایت کرتا اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا تھا۔[117]

جکڑ بندیوں میں کس رکھا ہے، یہ پیغمبر وہ سارے بوجھ اُتار دیتا ہے اور وہ تمام بندشیں توڑ کر زندگی کو آزاد کر دیتا ہے۔

۱۱۶ – اصل سلسلۂ کلام بنی اسرائیل سے متعلق چل رہا تھا۔ بیچ میں موقع کی مناسبت سے رسالتِ محمدیؐ پر ایمان لانے کی دعوت بطور جملۂ معترضہ آ گئی۔ اب پھر تقریر کا رُخ اسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جو پچھلے کئی رُکوعوں سے بیان ہو رہا ہے۔

۱۱۷ – بیشتر مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ موسیٰؑ کی قوم میں ایک گروہ ایسا ہے جو حق کے مطابق ہدایت اور انصاف کرتا ہے، یعنی ان کے نزدیک اس آیت میں بنی اسرائیل کی وہ اخلاقی و ذہنی حالت بیان کی گئی ہے جو نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ لیکن سیاق و سباق پر نظر کرتے ہوئے ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس آیت میں بنی اسرائیل کا وہ حال بیان

وَقَطَّعۡنٰهُمُ اثۡنَتَىۡ عَشۡرَةَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اِذِ اسۡتَسۡقٰٮهُ قَوۡمُهٗۤ اَنِ اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ‌ ۚ فَانۢبَجَسَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ ؕ وَظَلَّلۡنَا عَلَيۡهِمُ الۡغَمَامَ وَاَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهِمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰى ؕ كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا

اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انھیں مستقل گروہوں کی شکل دے دی تھی[118]۔ اور جب موسیٰؑ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو۔ چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھُوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعیّن کرلی۔ ہم نے اُن پر بادل کا سایہ کیا اور اُن پر مَنّ وسَلویٰ اتارا[119] — کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے

ہُوا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں تھا، اور اس سے مدّعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب اس قوم میں گوسالہ پرستی کے جرم کا ارتکاب کیا گیا اور حضرتِ حق کی طرف سے اس پر گرفت ہوئی تو اس وقت ساری قوم بگڑی ہوئی نہ تھی بلکہ اس میں ایک اچھا خاصا صالح عُنصر موجود تھا۔

۱۱۸ – اشارہ ہے بنی اسرائیل کی اُس تنظیم کی طرف جو سورۂ مائدہ، آیت ۱۲ میں بیان ہوئی ہے اور جس کی پوری تفصیل بائبل کی کتاب گنتی میں ملتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہِ سینا کے بیابان میں بنی اسرائیل کی مردم شماری کرائی، پھر ان کے ۱۲ گھرانوں کو، جو حضرت یعقوبؑ کے دس بیٹوں اور حضرت یوسفؑ کے دو بیٹوں کی نسل سے تھے، الگ الگ گروہوں کی شکل میں منظّم کیا، اور ہر گروہ پر ایک ایک سردار مقرر کیا، تاکہ وہ ان کے اندر اخلاقی، مذہبی، تمدّنی و معاشرتی اور فوجی حیثیّت سے نظم قائم رکھے اور احکامِ شریعت کا اجرا کرتا رہے۔ نیز حضرت یعقوبؑ کے بارھویں بیٹے لاوِی کی اولاد کو، جس کی نسل سے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ تھے، ایک الگ جماعت کی شکل میں منظّم کیا، تاکہ وہ ان سب قبیلوں کے درمیان شمعِ حق روشن رکھنے کی خدمت انجام دیتی رہے۔

۱۱۹ – اُوپر جس تنظیم کا ذکر کیا گیا ہے وہ من جملہ اُن احسانات کے تھی جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے۔ اس کے بعد اب مزید تین احسانات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جزیرہ نمائے سینا کے بیابانی علاقے میں ان کے لیے پانی کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ان کو دھوپ کی تپش سے بچانے کے لیے آسمان پر بادل چھا دیا گیا۔ تیسرے یہ کہ ان کے لیے خوراک کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام مَنّ وسلویٰ کے نُزول کی شکل میں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر اِن تین اہم ترین ضروریاتِ زندگی کا بندوبست نہ کیا جاتا تو یہ قوم جس کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی، اس علاقے میں بھوک پیاس سے بالکل ختم ہو جاتی۔

رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَ اِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا

تم کو بخشی ہیں۔ مگر اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ آپ اپنے ہی اُوپر ظلم کرتے رہے۔

یاد کرو[۱۲۰] وہ وقت جب ان سے کہا گیا تھا کہ ''اِس بستی میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے اپنے حسبِ منشا روزی حاصل کرو اور حِطَّۃٌ حِطَّۃٌ کہتے جاؤ اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو، ہم تمھاری خطائیں معاف کریں گے اور نیک رَوِیّہ رکھنے والوں کو مزید فضل سے نوازیں گے۔'' مگر جو لوگ اُن میں سے ظالم تھے انھوں نے اُس بات کو جو اُن سے

آج بھی کوئی شخص وہاں جائے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ اگر یہاں پندرہ بیس لاکھ آدمیوں کا ایک عظیم الشان قافلہ یکایک آٹھیرے تو اس کے لیے پانی، خوراک اور سایے کا آخر کیا انتظام ہوسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں پورے جزیرہ نما کی آبادی ۵۵ ہزار سے زیادہ نہیں ہے، اور آج اِس بیسویں صدی میں بھی اگر کوئی سلطنت وہاں پانچ چھ لاکھ فوج لے جانا چاہے تو اس کے مدبّروں کو رسد کے انتظام کی فکر میں دردِ سر لاحق ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے بہت سے محققین نے، جو نہ کتاب کو مانتے ہیں اور نہ معجزات کو تسلیم کرتے ہیں، یہ ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے اُس حصّے سے گزرے ہوں گے جس کا ذکر بائبل اور قرآن میں ہُوا ہے۔ ان کا گمان ہے کہ شاید یہ واقعات فلسطین کے جنوبی اور عرب کے شمالی حصّے میں پیش آئے ہوں گے۔ جزیرہ نمائے سینا کے طبعی اور معاشی جغرافیے کو دیکھتے ہوئے وہ اس بات کو بالکل ناقابلِ تصور سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی قوم یہاں برسوں ایک ایک جگہ پڑاؤ کرتی ہوئی گزر سکی تھی، خُصوصاً جب کہ مصر کی طرف سے اس کی رسد کا راستہ بھی منقطع تھا اور دوسری طرف خود اس جزیرہ نما کے مشرق اور شمال میں عمالِقہ کے قبیلے اس کی مزاحمت پر آمادہ تھے۔ ان اُمور کو پیشِ نظر رکھنے سے صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان چند مختصر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے جن احسانات کا ذکر فرمایا ہے، وہ درحقیقت کتنے بڑے احسانات تھے، اور اس کے بعد یہ کتنی بڑی احسان فراموشی تھی کہ اللہ کے فضل و کرم کی ایسی صریح نشانیاں دیکھ لینے پر بھی یہ قوم مسلسل ان نافرمانیوں اور غدّاریوں کی مرتکب ہوتی رہی جن سے اس کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ (تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حواشی ۷۲، ۷۳، ۷۶)

غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٢﴾ ع وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ

ع ۵ ۱۰ — وقف لازم — معانقة ٦

کہی گئی تھی بدل ڈالا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا۔[۱۲۱] ع

اور ذرا اِن سے اُس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی۔[۱۲۲] اِنھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سَبْت (ہفتہ) کے دن احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سَبْت ہی کے دن اُبھر اُبھر کر سطح پر اُن کے سامنے آتی تھیں[۱۲۳] اور سَبْت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لیے

۱۲۰ – اب تاریخ بنی اسرائیل کے اُن واقعات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مذکورۂ بالا احسانات کا جواب یہ لوگ کیسی کیسی مجرمانہ بے باکیوں کے ساتھ دیتے رہے اور پھر کس طرح مسلسل تباہی کے گڑھے میں گرتے چلے گئے۔

۱۲۱ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۷۴ و ۷۵۔

۱۲۲ – محققین کا غالب میلان اس طرف ہے کہ یہ مقام اَیلہ یا اَیلات یا اَیلوت تھا جہاں اب اسرائیل کی یہودی ریاست نے اسی نام کی ایک بندرگاہ بنائی ہے اور جس کے قریب ہی اُردُن کی مشہور بندرگاہ عَقَبَہ واقع ہے۔ اس کی جائے وقوع بحرِ قُلزُم کی اُس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے جو جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔ بنی اسرائیل کے زمانۂ عروج میں یہ بڑا اہم تجارتی مرکز تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے اپنے بحرِ قُلزُم کے جنگی و تجارتی بیڑے کا صدر مقام اِسی شہر کو بنایا تھا۔

جس واقعے کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے، اس کے متعلق یہودیوں کی کُتُبِ مقدّسہ میں کوئی ذکر ہمیں نہیں ملتا اور ان کی تاریخیں بھی اس باب میں خاموش ہیں، مگر قرآنِ مجید میں جس انداز سے اس واقعے کو یہاں اور سورۂ بقرہ میں بیان کیا گیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نُزولِ قرآن کے دَور میں بنی اسرائیل بالعُموم اس واقعے سے خوب واقف تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ مدینے کے یہودیوں نے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، قرآن کے اس بیان پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیا۔

النصف

نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا

ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمایش میں ڈال رہے[۱۲۴] تھے۔ اور انھیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب اُن میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ "تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے" تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ "ہم یہ سب کچھ تمھارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس اُمّید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں۔" آخرِ کار جب وہ اُن ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو

۱۲۳ – "سَبْت" ہفتے کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن بنی اسرائیل کے لیے مقدس قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور اولادِ اسرائیل کے درمیان پشت در پشت تک دائمی عہد کا نشان قرار دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ اس روز کوئی دنیوی کام نہ کیا جائے، گھروں میں آگ تک نہ جلائی جائے، جانوروں اور لونڈی غلاموں تک سے کوئی خدمت نہ لی جائے، اور یہ کہ جو شخص اس ضابطے کی خلاف ورزی کرے، اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن بنی اسرائیل نے آگے چل کر اس قانون کی عَلانِیہ خلاف ورزی شروع کر دی۔ یَرمیاہ نبی کے زمانے میں (جو ۶۲۸ اور ۵۸۶ قبلِ مسیح کے درمیان گزرے ہیں) خاص یروشلم کے پھاٹکوں سے لوگ سَبْت کے دن مال اسباب لے لے کر گزرتے تھے۔ اس پر نبیِ موصوف نے خدا کی طرف سے یہودیوں کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی اس کُھلّم کُھلّا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذرِ آتش کر دیا جائے گا (یَرمیاہ ۱۷: ۲۱-۲۷)۔ اسی کی شکایت حِزقی اِیل نبی بھی کرتے ہیں جن کا دور ۵۹۵ اور ۵۳۶ قبلِ مسیح کے درمیان گزرا ہے، چنانچہ ان کی کتاب میں سَبْت کی بے حُرمتی کو یہودیوں کے قومی جرائم میں سے ایک بڑا جرم قرار دیا گیا ہے (حِزقی اِیل ۲۰: ۱۲-۲۴)۔ ان حوالوں سے یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ قرآنِ مجید یہاں جس واقعے کا ذکر کر رہا ہے، وہ بھی غالباً اسی دَور کا واقعہ ہو گا۔

۱۲۴ – اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمایش کے لیے جو طریقے اختیار فرماتا ہے، ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب کسی شخص یا گروہ کے اندر فرماں برداری سے انحراف اور نافرمانی کی جانب مَیلان بڑھنے لگتا ہے، تو اس کے سامنے نافرمانی کے مواقع کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے، تاکہ اس کے وہ مَیلانات جو اندر چُھپے ہوئے ہیں کُھل کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں، اور جن جرائم سے وہ اپنے دامن کو خود داغ دار کرنا چاہتا ہے ان سے وہ صرف اس لیے باز نہ رہ جائے کہ ان کے ارتکاب کے مواقع اُسے نہ مل

ذُكِّرُوا بِهِۦٓ أَنجَيْنَا ٱلَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ ٱلسُّوٓءِ وَأَخَذْنَا ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ بِعَذَابٍۭ بَـِٔيسٍۭ بِمَا كَانُوا۟ يَفْسُقُونَ ﴿١٦٥﴾ فَلَمَّا عَتَوْا۟ عَن مَّا نُهُوا۟ عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا۟ قِرَدَةً

انھیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے اُن لوگوں کو بچا لیا جو بُرائی سے روکتے تھے اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔[125] پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کیے چلے گئے جس سے انھیں روکا گیا تھا، تو ہم نے کہا کہ بندر ہو جاؤ

رہے ہوں۔

۱۲۵ – اس بیان سے معلوم ہُوا کہ اس بستی میں تین قسم کے لوگ موجود تھے: ایک وہ جو دھڑلّے سے احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے اور ناصحوں سے کہتے تھے کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل ہے۔ تیسرے وہ جن کی غیرتِ ایمانی حُدود اللہ کی اس کُھلّم کُھلّا بے حُرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہِ راست پر آ جائیں، اور اگر وہ راہِ راست نہ اختیار کریں تب بھی ہم اپنی حد تک تو اپنا فرض ادا کر کے خدا کے سامنے اپنی بَراءت کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس صورتِ حال میں جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا تو قرآنِ مجید کہتا ہے کہ اِن تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ ہی اس سے بچایا گیا، کیونکہ اسی نے خدا کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی، اور وہی تھا جس نے اپنی براءت کا ثبوت فراہم کر رکھا تھا۔ باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہُوا اور وہ اپنے جرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے۔

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے گروہ کے مبتلائے عذاب ہونے کی اور تیسرے گروہ کے نجات پانے کی تصریح کی ہے، لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں سُکوت اختیار کیا ہے، لہٰذا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نجات پانے والوں میں سے تھا یا مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے۔ پھر ایک رِوایت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ وہ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ دوسرا گروہ مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے تھا، بعد میں ان کے شاگرد عِکرِمہ نے ان کو مطمئن کر دیا کہ دوسرا گروہ نجات پانے والوں میں شامل تھا۔ لیکن قرآن کے بیان پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ کا پہلا خیال ہی صحیح تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی بستی پر خدا کا عذاب آنے کی صورت میں تمام بستی دو ہی گروہوں میں تقسیم ہو سکتی ہے: ایک وہ جو عذاب میں مبتلا ہو، اور دوسرا وہ جو بچا لیا جائے۔ اب اگر قرآن کی تصریح کے مطابق بچنے والا گروہ صرف تیسرا تھا، تو لامحالہ پہلے اور دوسرے دونوں گروہ نہ بچنے والوں میں شامل ہوں گے۔ اسی کی

خٰسِـِٕیْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖۚ

ذلیل اور خوار۔[۱۲۶]

اور یاد کرو جب کہ تمھارے رب نے اعلان کر دیا[۱۲۷] کہ "وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلّط کرتا رہے گا جو اُن کو بدترین عذاب دیں گے"[۱۲۸]، یقیناً تمھارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے

تائید مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ کے فقرے سے بھی ہوتی ہے، جس کی توثیق بعد کے فقرے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس بستی میں عَلانِیَہ احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو وہ ساری کی ساری قابلِ مواخذہ ہوتی ہے اور اس کا کوئی باشندہ محض اس بنا پر مواخذے سے بَری نہیں ہوسکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی، بلکہ اُسے خدا کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لازماً اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ وہ اپنی حدِ استطاعت تک اصلاح اور اقامتِ حق کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر قرآن اور حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ہم کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (ڈرو اُس فتنے سے جس کے وبال میں خصوصیّت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہیں ہوں گے جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو)۔ اور اس کی تشریح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان اللّٰہ لا یعذب العامة بعمل الخاصة حتّٰی یروا المنکر بین ظھرانیھم وھم قادرون علٰی ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذٰلك عذب اللّٰہ الخاصة والعامة، "یعنی اللہ عزّ وجلّ خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا، جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بُرے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہارِ ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہارِ ناراضی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

مزید برآں جو آیات اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں، ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی پر خدا کا عذاب دو قسطوں میں نازل ہوا تھا۔ پہلی قسط وہ جسے عَذَابٍۭ بَىِٕیْسٍ (سخت عذاب) فرمایا گیا ہے، اور دوسری قسط وہ جس میں نافرمانی پر اصرار کرنے والوں کو بندر بنا دیا گیا۔ ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ پہلی قسط کے عذاب میں پہلے دونوں گروہ شامل تھے، اور دوسری قسط کا عذاب صرف پہلے گروہ کو دیا گیا تھا، واللہ اعلمُ بالصواب۔ اِن اصبتُ فمن اللّٰہ وان اخطأتُ فمن نفسی، واللّٰہ غفورٌ رحیم۔

۱۲۶– تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۸۳۔

۱۲۷– اصل میں لفظ تَاَذَّنَ استعمال ہوا ہے، جس کا مفہوم تقریباً وہی ہے جو نوٹس دینے یا خبردار کر دینے کا ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ؗ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ

اور یقیناً وہ درگزر اور رحم سے بھی کام لینے والا ہے۔

ہم نے ان کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا۔ کچھ لوگ ان میں نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم ان کو اچھّے اور بُرے حالات سے آزمایش میں مُبتلا کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ آئیں۔ پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخَلَف لوگ ان کے جانشین ہوئے جو کتابِ الٰہی کے وارث ہو کر اِسی دنیائے دَنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا، اور اگر وہی مَتاعِ دُنیا پھر سامنے آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔[۱۲۹]

۱۲۸ — یہ تنبیہ بنی اسرائیل کو تقریباً آٹھویں صدی قبلِ مسیح سے مسلسل کی جا رہی تھی۔ چنانچہ یہودیوں کے مجموعۂ کُتُبِ مُقدّسہ میں یَسعیاہ اور یَرمیاہ اور ان کے بعد آنے والے انبیاؑ کی تمام کتابیں اسی تنبیہ پر مشتمل ہیں۔ پھر یہی تنبیہ مسیح علیہ السلام نے انھیں کی، جیسا کہ اناجیل میں ان کی متعدِّد تقریروں سے ظاہر ہے۔ آخر میں قرآن نے اس کی توثیق کی۔ اب یہ بات قرآن اور اس سے پہلے صحیفوں کی صداقت پر ایک بَیِّن شہادت ہے کہ اُس وقت سے لے کر آج تک تاریخ میں کوئی دَور ایسا نہیں گزرا ہے جس میں یہودی قوم دنیا میں کہیں نہ کہیں روندی اور پامال نہ کی جاتی رہی ہو۔

۱۲۹ — یعنی گناہ کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ گناہ ہے، مگر اِس بھروسے پر اس کا ارتکاب کرتے ہیں کہ ہماری تو کسی نہ کسی طرح بخشش ہو ہی جائے گی، کیونکہ ہم خدا کے چہیتے ہیں اور خواہ ہم کچھ ہی کریں، بہرحال ہماری مغفرت ہونی ضروری ہے۔ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ گناہ کرنے کے بعد وہ نہ شرمندہ ہوتے ہیں نہ توبہ کرتے ہیں، بلکہ جب پھر ویسے ہی گناہ کا موقع سامنے آتا ہے تو پھر اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بدنصیب لوگ! اُس کتاب کے وارث ہوئے جو اُن کو دنیا کا امام بنانے والی تھی، مگر ان کی کم ظرفی اور پست خیالی نے اس نسخۂ کیمیا کو لے کر دنیا کی متاعِ حقیر کمانے سے زیادہ بلند کسی چیز کا حوصلہ نہ کیا، اور بجائے اس کے کہ دنیا میں عدل و راستی کے عَلَم بردار

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ

کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو حق ہو؟ اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے[۱۳۰]۔ آخرت کی قیام گاہ تو خدا ترس لوگوں کے لیے ہی بہتر ہے[۱۳۱]، کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟ جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنھوں نے نماز قائم رکھی ہے، یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔ انھیں وہ وقت بھی کچھ یاد ہے جب کہ ہم نے پہاڑ کو ہِلا کر ان پر اس طرح چھا دیا تھا کہ گویا وہ چھتری ہے، اور یہ گمان کر رہے تھے کہ وہ ان پر آ پڑے گا، اور اُس وقت

اور خیر و صلاح کے رہنما بنتے، محض دنیا کے کُتّے بن کر رہ گئے۔

۱۳۰ — یعنی یہ خود جانتے ہیں کہ تورات میں کہیں بھی بنی اسرائیل کے لیے نجات کے غیر مشروط پروانے کا ذکر نہیں ہے۔ نہ خدا نے کبھی ان سے یہ کہا اور نہ ان کے پیغمبروںؑ نے کبھی ان کو یہ اطمینان دلایا کہ تم جو چاہو کرتے پھرو بہر حال تمھاری مغفرت ضرور ہوگی۔ پھر آخر انھیں کیا حق ہے کہ خدا کی طرف وہ بات منسوب کریں جو خود خدا نے کبھی نہیں کہی، حالانکہ ان سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ خدا کے نام سے کوئی بات خلافِ حق نہ کہیں گے۔

۱۳۱ — اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں: ایک وہ جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ ”خدا ترس لوگوں کے لیے تو آخرت کی قیام گاہ ہی بہتر ہے۔“ پہلے ترجمے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مغفرت کسی کا ذاتی یا خاندانی اجارہ نہیں ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ تم کام تو وہ کرو جو سزا دینے کے لائق ہوں مگر تمھیں آخرت میں جگہ مل جائے اچھی، محض اس لیے کہ تم یہودی یا اسرائیلی ہو۔ اگر تم میں کچھ بھی عقل موجود ہو تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ آخرت میں اچھا مقام صرف اُنھی لوگوں کو مل سکتا ہے جو دنیا میں خدا ترسی کے ساتھ کام کریں۔ رہا دوسرا ترجمہ، تو اس کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ دنیا اور اس کے فائدوں کو آخرت پر ترجیح دینا تو صرف اُن لوگوں کا کام ہے جو ناخدا ترس ہوں، خدا ترس لوگ تو لازماً دنیا کی مَصلَحتوں پر آخرت کی مَصلَحت

خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ع
وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ
وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚۛ شَهِدْنَا ۚۛ معانقة ۷

ہم نے ان سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمھیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامو اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو، توقع ہے کہ تم غلط روی سے بچے رہو گے۔[۱۳۲] ع

اور[۱۳۳] اے نبیؐ! لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمھارے رب نے بنی آدم کی پُشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انھیں خود ان کے اُوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا: ”کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟“ انھوں نے کہا: ”ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔“[۱۳۴] یہ ہم نے اس لیے کیا کہ

کو اور دنیا کے عیش پر آخرت کی بھلائی کو ترجیح دیتے ہیں۔

۱۳۲ – اشارہ ہے اُس واقعے کی طرف جو موسیٰ علیہ السلام کو شہادت نامے کی سنگین لوحیں عطا کیے جانے کے موقع پر کوہِ سینا کے دامن میں پیش آیا تھا۔ بائبل میں اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> ”اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے، اور وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے، اور کوہِ سینا اُوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا، کیونکہ خداوند شعلے میں ہو کر اُس پر اُترا اور دھواں تنور کے دُھوئیں کی طرح اُوپر کو اُٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہِل رہا تھا۔“ (خُروج ۱۹: ۱۷-۱۸)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کتاب کی پابندی کا عہد لیا اور عہد لیتے ہوئے خارج میں ان پر ایسا ماحول طاری کر دیا جس سے انھیں خدا کے جلال اور اس کی عظمت و برتری اور اس کے عہد کی اہمیّت کا پورا پورا احساس ہو اور وہ اس شہنشاہِ کائنات کے ساتھ میثاق اُستوار کرنے کو کوئی معمولی سی بات نہ سمجھیں۔ اس سے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ وہ خدا کے ساتھ میثاق باندھنے پر آمادہ نہ تھے اور انھیں زبردستی خوف زدہ کر کے اس پر آمادہ کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب اہلِ ایمان تھے اور دامنِ کوہ میں میثاق باندھنے ہی کے لیے گئے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے معمولی طور پر ان سے عہد و اقرار لینے کے بجائے مناسب جانا کہ اس عہد و اقرار کی اہمیّت ان کو اچھی طرح محسوس کرا دی جائے، تاکہ اقرار کرتے وقت انھیں یہ احساس رہے کہ وہ کس قادرِ مُطلق ہستی سے اقرار کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ بد عہدی کرنے کا انجام کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

یہاں پہنچ کر بنی اسرائیل سے خطاب ختم ہو جاتا ہے اور بعد کے رُکوعوں میں تقریر کا رُخ عام انسانوں کی طرف پھرتا ہے، جن میں خُصوصیّت کے ساتھ رُوئے سُخن ان لوگوں کی جانب ہے جو براہِ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مُخاطَب تھے۔

۱۳۳ – اُوپر کا سلسلۂ بیان اُس بات پر ختم ہُوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بندگی و اطاعت کا عہد لیا تھا۔ اب عام انسانوں کی طرف خطاب کر کے انھیں بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، درحقیقت تم سب اپنے خالق کے ساتھ ایک میثاق میں بندھے ہوئے ہو اور تمھیں ایک روز جواب دہی کرنی ہے کہ تم نے اس میثاق کی کہاں تک پابندی کی۔

۱۳۴ – جیسا کہ متعدّد احادیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ معاملہ تخلیقِ آدمؑ کے موقع پر پیش آیا تھا۔ اس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے انسانِ اوّل کو سجدہ کرایا گیا تھا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا گیا تھا، اُسی طرح پوری نسلِ آدمؑ کو بھی، جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی، اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی رُبُوبیّت کی شہادت لی تھی۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت اُبَیؓ بن کعب نے غالبًا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کر کے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ اس مضمون کی بہترین شرح ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ”اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کیا اور (ایک ایک قسم یا ایک ایک دَور کے) لوگوں کو الگ الگ گروہوں کی شکل میں مُرتّب کر کے انھیں انسانی صورت اور گویائی کی طاقت عطا کی، پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور انھیں آپ اپنے اُوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے عرض کیا: ضرور آپ ہمارے رب ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر زمین و آسمان سب کو اور خود تمھارے باپ آدمؑ کو گواہ ٹھیراتا ہوں، تاکہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں ہے، اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا۔ میں تمھارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا، جو تم کو یہ عہد و میثاق، جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو، یاد دلائیں گے، اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔ اس پر سب انسانوں نے کہا کہ ہم گواہ ہوئے، آپ ہی ہمارے رب اور آپ ہی ہمارے معبُود ہیں، آپ کے سوا نہ کوئی ہمارا رب ہے نہ کوئی معبود۔“

اس معاملے کو بعض لوگ محض تمثیلی اندازِ بیان پر محمول کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دراصل یہاں قرآنِ مجید صرف یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ اللہ کی رُبُوبیّت کا اقرار انسانی فطرت میں پیوست ہے، اور اس بات کو یہاں ایسے انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا یہ ایک واقعہ تھا جو عالَمِ خارجی میں پیش آیا۔ لیکن ہم اس تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے۔ قرآن اور حدیث دونوں میں اسے بالکل ایک واقعے کے طور پر بیان کیا گیا ہے، اور صرف بیانِ واقعہ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی ارشاد ہُوا ہے کہ قیامت کے روز بنی آدم پر حُجّت قائم کرتے ہوئے اس ازلی عہد و اقرار کو سند میں پیش کیا جائے گا۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم اُسے محض ایک تمثیلی بیان قرار دیں۔ ہمارے نزدیک یہ واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا تھا جس طرح عالَمِ خارجی میں واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع اُن تمام انسانوں کو، جنھیں وہ قیامت تک پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، بیک وقت زندگی اور شعور اور گویائی عطا کر کے اپنے سامنے حاضر کیا تھا، اور فی الواقع انھیں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا کہ ان کا کوئی رب اور کوئی الٰہ اُس کی ذاتِ اقدس و اعلیٰ کے سوا نہیں ہے، اور ان کے لیے کوئی صحیح طریقِ زندگی اُس کی بندگی و فرماں برداری (اسلام) کے سوا نہیں ہے۔ اس اجتماع کو اگر کوئی شخص بعید از امکان سمجھتا ہے تو یہ محض اس کے دائرۂ فکر کی تنگی کا نتیجہ ہے، ورنہ حقیقت میں تو نسلِ انسانی کی موجودہ تدریجی

اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ

کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ "ہم تو اس بات سے بے خبر تھے"، یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اُس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا۔"[۱۳۵] دیکھو! اِس طرح

پیدائش جتنی قریب از امکان ہے، اتنا ہی اَزَل میں ان کا مجموعی ظُہور، اور ابد میں ان کا مجموعی حشر ونشر بھی قریب از امکان ہے۔ پھر یہ بات نہایت معقول معلوم ہوتی ہے کہ انسان جیسی صاحبِ عقل وشعور اور صاحبِ تصرف واختیارات مخلوق کو زمین پر بحیثیتِ خلیفہ مامور کرتے وقت اللہ تعالیٰ اسے حقیقت سے آگاہی بخشے اور اس سے اپنی وفاداری کا اقرار (oath of allegiance) لے۔ اس معاملے کا پیش آنا قابلِ تعجب نہیں، البتہ اگر یہ پیش نہ آتا تو ضرور قابلِ تعجب ہوتا۔

۱۳۵ – اس آیت میں وہ غرض بیان کی گئی ہے جس کے لیے ازل میں پوری نسلِ آدم سے اقرار لیا گیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت اختیار کریں، وہ اپنے اِس جرم کے پوری طرح ذمہ دار قرار پائیں۔ اُنھیں اپنی صفائی میں نہ تو لاعلمی کا عذر پیش کرنے کا موقع ملے اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈال کر خود بَری الذمہ ہوسکیں۔ گویا بالفاظِ دیگر، اللہ تعالیٰ اس اَزَلی عہد ومیثاق کو اس بات پر دلیل قرار دیتا ہے کہ نوعِ انسانی میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ کے الٰہِ واحد اور ربِّ واحد ہونے کی شہادت اپنے اندر لیے ہوئے ہے، اور اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی شخص کامل بے خبری کے سبب سے، یا ایک گمراہ ماحول میں پرورش پانے کے سبب سے اپنی گمراہی کی ذمّہ داری سے بالکُلّیّہ بَری ہوسکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ اَزَلی میثاق فی الواقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شُعور اور حافظے میں محفوظ ہے؟ کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغازِ آفرینش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا سوال ہوا تھا اور اس نے بَلٰی کہا تھا؟ اگر نہیں، تو پھر اُس اقرار کو، جس کی یاد ہمارے شُعور وحافظہ سے محو ہوچکی ہے، ہمارے خلاف حجت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اُس میثاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظے میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کا دنیا کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرے سے فضول ہوجاتا، کیونکہ اس کے بعد تو اس آزمایش وامتحان کے کوئی معنیٰ ہی باقی

نہ رہ جاتے۔ لہٰذا اس نقش کو شعور و حافظہ میں تو تازہ نہیں رکھا گیا، لیکن وہ تحت الشّعور (sub-conscious mind) اور وِجدان (intuition) میں یقیناً محفوظ ہے۔ اس کا حال وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشّعوری اور وجدانی عُلوم کا حال ہے۔ تہذیب و تمدُّن اور اخلاق و معاملات کے تمام شعبوں میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا ہے، وہ سب درحقیقت انسان کے اندر بِالقُوَّۃ (potentially) موجود تھا۔ خارجی محرکات اور داخلی تحریکات نے مِل جُل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بِالقُوَّۃ تھا، اُسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم، کوئی تربِیَت، کوئی ماحولی تاثیر اور کوئی داخلی تحریک انسان کے اندر کوئی چیز بھی، جو اُس کے اندر بِالقُوَّۃ موجود نہ ہو، ہرگز پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اسی طرح یہ سب مؤثّرات اگر اپنا تمام زور بھی صَرف کر دیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اُن چیزوں میں سے، جو انسان کے اندر بِالقُوَّۃ موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محو کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں، وہ صرف یہ ہے کہ اسے اصل فطرت سے منحرف (pervert) کر دیں۔ لیکن وہ چیز تمام تحریفات و تمسیخات کے باوجود اندر موجود رہے گی، ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی رہے گی، اور خارجی اپیل کا جواب دینے کے لیے مستعد رہے گی۔ یہ معاملہ، جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی علوم کے ساتھ عام ہے:

وہ سب ہمارے اندر بِالقُوَّۃ موجود ہیں، اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت اُن چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ان سب کے ظہور میں آنے کے لیے خارجی تذکیر (یاددہانی)، تعلیم، تربِیَت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے، اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گویا درحقیقت خارجی اپیل کا وہ جواب ہے جو ہمارے اندر کی بِالقُوَّۃ موجودات کی طرف سے ملتا ہے۔

ان سب کو اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات دبا کر، پردہ ڈال کر، منحرف اور مسخ کر کے کالعدم کر سکتی ہیں مگر بالکل معدوم نہیں کر سکتیں، اور اسی لیے اندرونی احساس اور بیرونی سعی، دونوں سے اصلاح اور تبدیلی (conversion) ممکن ہوتی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی کیفیت اُس وجدانی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت، اور خالقِ کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے:

اس کے موجود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر دَور میں، زمین کے ہر خطّے میں، ہر بستی، ہر پشت اور ہر نسل میں اُبھرتا رہا ہے اور کبھی دنیا کی کوئی طاقت اسے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔

اس کے مطابقِ حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی وہ اُبھر کر بالفعل ہماری زندگی میں کارفرما ہُوا ہے، اس نے صالح اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

اس کو اُبھرنے اور ظہور میں آنے اور عملی صورت اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی اپیل کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے، چنانچہ انبیا علیہم السلام اور کُتُبِ آسمانی اور ان کی پیروی کرنے والے داعیانِ حق سب کے سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ اسی لیے اُن کو قرآن میں مذکِّر (یاددلانے والے)، ذکر (یاد)، تذکرہ (یادداشت)، اور ان کے کام کو تذکیر (یاددہانی) کے الفاظ

نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ

ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں[۱۳۶]۔ اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں[۱۳۷]۔

اور اے محمدؐ! اِن کے سامنے اُس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا

سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انبیاؑ اور کتابیں اور داعیانِ حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے، بلکہ اُسی چیز کو اُبھارتے اور تازہ کرتے ہیں جو اُن کے اندر پہلے سے موجود تھی۔

نفسِ انسانی کی طرف سے ہر زمانے میں اِس تذکیر کا جواب بصورتِ لبیک ملنا اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ اندر فی الواقع کوئی علم چھپا ہُوا تھا جو اپنے پکارنے والے کی آواز پہچان کر جواب دینے کے لیے اُبھر آیا۔

پھر اسے جہالت اور جاہلیّت اور خواہشاتِ نفس اور تعصّبات اور شیاطینِ جن وانس کی گمراہ کُن تعلیمات وترغیبات نے ہمیشہ دبانے اور چھُپانے اور منحرف اور مسخ کرنے کی کوشش کی ہے، جس کے نتیجے میں شرک، دہریّت، اِلحاد، زَندقہ اور اخلاقی وعملی فساد رُونما ہوتا ہے۔ لیکن ضلالت کی ان ساری طاقتوں کے مُتّحِدہ عمل کے باوجود اس علم کا پیدائشی نقش انسان کی لوحِ دل پر کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے اور اسی لیے تذکیر وتجدید کی کوششیں اُسے اُبھارنے میں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔

بلاشبہ دنیا کی موجودہ زندگی میں جو لوگ حق اور حقیقت کے انکار پر مُصِرّ ہیں، وہ اپنی حجت بازیوں سے اس پیدائشی نقش کے وجود کا انکار کر سکتے ہیں، یا کم از کم اسے مُشتَبَہ ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن جس روز یوم الحساب برپا ہوگا اس روز ان کا خالق ان کے شعور وحافظہ میں روزِ اوّل کے اُس اجتماع کی یاد تازہ کر دے گا جب کہ انھوں نے اس کو اپنا واحد معبود اور واحد رب تسلیم کیا تھا۔ پھر وہ اس بات کا ثبوت بھی ان کے اپنے نفس ہی سے فراہم کر دے گا کہ اس میثاق کا نقش ان کے نفس میں برابر موجود رہا، اور یہ بھی وہ ان کی اپنی زندگی ہی کے ریکارڈ سے علیٰ رُؤس الاشہاد دکھا دے گا کہ انھوں نے کس کس طرح اس نقش کو دبایا، کب کب اور کن کن مواقع پر ان کے قلب سے تصدیق کی آوازیں اُٹھیں، اپنی اور اپنے گرد وپیش کی گمراہیوں پر ان کے وجدان نے کہاں کہاں اور کس کس وقت صدائے انکار بلند کی، داعیانِ حق کی دعوت کا جواب دینے کے لیے ان کے اندر کا چُھپا ہوا علم کتنی کتنی مرتبہ اور کس کس جگہ اُبھرنے پر آمادہ ہُوا، اور پھر وہ اپنے تعصّبات اور اپنی خواہشاتِ نفس کی بنا پر کیسے کیسے حیلوں اور بہانوں سے اس کو فریب دیتے اور خاموش کر دیتے رہے۔ وہ وقت جب کہ یہ سارے راز فاش ہوں گے، حجت بازیوں کا نہ ہوگا، بلکہ صاف صاف اقرارِ جرم کا ہوگا۔ اسی لیے قرآنِ مجید کہتا ہے کہ اس وقت مجرمین یہ نہیں کہیں گے کہ ہم جاہل تھے یا غافل تھے، بلکہ یہ کہنے پر مجبُور ہوں گے کہ ہم کافر تھے، یعنی ہم نے جان بُوجھ کر حق کا انکار کیا۔ وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ (الانعام: ۱۳۰)

۱۳۶ — یعنی معرفتِ حق کے جو نشانات انسان کے اپنے نفس میں موجود ہیں، ان کا صاف صاف پتا دیتے ہیں۔

اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿١٧٥﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

علم عطا کیا تھا[138] مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخرِ کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا۔ یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے اُن آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہشِ نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا، لہٰذا اس کی حالت کتّے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔[139] یہی مثال ہے اُن لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔

۱۳۷ — یعنی بغاوت و انحراف کی رَوِش چھوڑ کر بندگی و اطاعت کے رَوِیّے کی طرف واپس ہوں۔

۱۳۸ — اِن الفاظ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ضرور کوئی متعین شخص ہوگا جس کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی یہ انتہائی اخلاقی بلندی ہے کہ وہ جب کبھی کسی کی بُرائی کو مثال میں پیش کرتے ہیں تو بالعُموم اس کے نام کی تصریح نہیں کرتے، بلکہ اس کی شخصیّت پر پردہ ڈال کر صرف اس کی بُری مثال کا ذکر کر دیتے ہیں، تاکہ اس کی رسوائی کیے بغیر اصل مقصد حاصل ہو جائے۔ اسی لیے نہ قرآن میں بتایا گیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں کہ وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے، کون تھا۔ مفسرین نے عہدِ رسالت اور اس سے پہلے کی تاریخ کے مختلف اشخاص پر اس مثال کو چسپاں کیا ہے۔ کوئی بَلعَم بن باعُورا کا نام لیتا ہے، کوئی اُمیَّہ بن ابی الصَّلت کا، اور کوئی صَیفی ابن الراہب کا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خاص شخص تو پردے میں ہے جو اس تمثیل میں پیشِ نظر تھا، البتہ یہ تمثیل ہر اُس شخص پر چسپاں ہوتی ہے جس میں یہ صفت پائی جاتی ہو۔

۱۳۹ — اِن دو مختصر سے فقروں میں بڑا اہم مضمون ارشاد ہُوا ہے، جسے ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١٧٦﴾ سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٧٧﴾

تم یہ حکایات اِن کو سناتے رہو، شاید کہ یہ کچھ غور وفکر کریں۔ بڑی ہی بُری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنھوں نے ہماری آیات کو جُھٹلایا، اور وہ آپ اپنے ہی اُوپر ظلم کرتے رہے ہیں۔

وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے، آیاتِ الٰہی کا علم رکھتا تھا، یعنی حقیقت سے واقف تھا۔ اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس رَوِیّے سے بچتا جس کو وہ غلط جانتا تھا، اور وہ طرزِ عمل اختیار کرتا جو اسے معلوم تھا کہ صحیح ہے۔ اسی عمل مطابقِ علم کی بدولت اللہ تعالیٰ اس کو انسانیت کے بلند مراتب پر ترقی عطا کرتا۔ لیکن وہ دنیا کے فائدوں اور لذّتوں اور آرایشوں کی طرف جھک پڑا، خواہشاتِ نفس کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اُس نے ان کے آگے سِپَر ڈال دی، معالیِ اُمور کی طلب میں دنیا کی حرص وطمع سے بالاتر ہونے کے بجائے وہ اس حرص وطمع سے ایسا مغلوب ہوا کہ اپنے سب اُونچے ارادوں اور اپنی عقلی و اخلاقی ترقی کے سارے امکانات کو طلاق دے بیٹھا، اور اُن تمام حُدود کو توڑ کر نکل بھاگا جن کی نگہداشت کا تقاضا خود اُس کا علم کر رہا تھا۔ پھر جب وہ محض اپنی اَخلاقی کمزوری کی بنا پر جانتے بُوجھتے حق سے منہ موڑ کر بھاگا تو شیطان، جو قریب ہی اس کی گھات میں لگا ہوا تھا، اس کے پیچھے لگ گیا اور برابر اُسے ایک پستی سے دوسری پستی کی طرف لے جاتا رہا، یہاں تک کہ ظالم نے اسے اُن لوگوں کے زُمرے میں پہنچا کر ہی دم لیا جو اس کے دام میں پھنس کر پوری طرح اپنی متاعِ عقل و ہوش گم کر چکے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کی حالت کو کُتّے سے تشبیہ دیتا ہے، جس کی ہر وقت لٹکی ہوئی زبان اور ٹپکتی ہوئی رال ایک نہ بجھنے والی آتشِ حرص اور کبھی نہ سیر ہونے والی نیت کا پتا دیتی ہے۔ بِنائے تشبیہ وہی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی اُردو زبان میں ایسے شخص کو جو دنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو، دنیا کا کتّا کہتے ہیں۔ کُتّے کی جِبلّت کیا ہے؟ حرص و آز۔ چلتے پھرتے اس کی ناک زمین سونگھنے ہی میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے بُوئے طعام آ جائے۔ اسے پتھر ماریے تب بھی اس کی یہ توقع دُور نہیں ہوتی کہ شاید یہ چیز جو پھینکی گئی ہے، کوئی ہڈی یا روٹی کا کوئی ٹکڑا ہو۔ پیٹ کا بندہ ایک دفعہ تو لپک کر اس کو بھی دانتوں سے پکڑ ہی لیتا ہے۔ اس سے بے التفاتی کیجیے تب بھی وہ لالچ کا مارا توقعات کی ایک دنیا دل میں لیے، زبان لٹکائے، ہانپتا کانپتا کھڑا ہی رہے گا۔ ساری دنیا کو وہ بس پیٹ ہی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کہیں کوئی بڑی سی لاش پڑی ہو، جو کئی کُتّوں کے کھانے کو کافی ہو، تو ایک کتا اس میں سے صرف اپنا حصّہ لینے پر اکتفا نہ کرے گا، بلکہ اسے صرف اپنے ہی لیے مخصوص رکھنا چاہے گا اور کسی دوسرے کتّے کو اس کے پاس نہ پھٹکنے دے گا۔ اس شہوتِ شکم کے بعد اگر کوئی چیز اس پر غالب ہے تو وہ ہے شہوتِ فَرج۔ اپنے سارے جسم میں سے صرف ایک شرمگاہ ہی وہ چیز ہے جس سے وہ دل چسپی رکھتا ہے، اور اسی کو سونگھنے اور

مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِىۡ‌ ۚ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۷۸﴾ وَلَـقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَـهَنَّمَ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ ‌ۖ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا ‌ؕ اُولٰۤـئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ‌ ؕ اُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ ﴿۱۷۹﴾

جسے اللہ ہدایت بخشے بس وہی راہِ راست پاتا ہے اور جس کو اللہ اپنی رہنمائی سے محروم کر دے وہی ناکام و نامراد ہو کر رہتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنّم ہی کے لیے پیدا کیا ہے[۱۴۰]۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔

چاٹنے میں مشغول رہتا ہے۔ پس تشبیہ کا مدّعا یہ ہے کہ دنیا پرست آدمی جب علم اور ایمان کی رسّی تڑا کر بھاگتا ہے اور نفس کی اندھی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے، تو پھر کُتّے کی حالت کو پہنچے بغیر نہیں رہتا، ہمہ تن پیٹ اور ہمہ تن شرمگاہ۔

۱۴۰ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے اُن کو پیدا ہی اس غرض کے لیے کیا تھا کہ وہ جہنم میں جائیں اور ان کو وجود میں لاتے وقت ہی یہ ارادہ کر لیا تھا کہ انھیں دوزخ کا ایندھن بنانا ہے، بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تو ان کو پیدا کیا تھا دل، دماغ، آنکھیں اور کان دے کر، مگر ظالموں نے ان سے کوئی کام نہ لیا اور اپنی غلط کاریوں کی بدولت آخرِ کار جہنّم کا ایندھن بن کر رہے۔ اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے وہ اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جو انسانی زبان میں انتہائی افسوس اور حسرت کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی ماں کے متعدّد جوان بیٹے لڑائی میں جا کر لقمۂ اجل ہو گئے ہوں تو وہ لوگوں سے کہتی ہے کہ میں نے انھیں اس لیے پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ لوہے اور آگ کے کھیل میں ختم ہو جائیں۔ اِس قول سے اس کا مدّعا یہ نہیں ہوتا کہ واقعی اس کے پالنے پوسنے کی غرض یہی تھی، بلکہ اس حسرت بھرے انداز میں دراصل وہ کہنا یہ چاہتی ہے کہ میں نے تو اتنی محنتوں سے اپنا خونِ جگر پلا پلا کر ان بچوں کو پالا تھا، مگر خدا اِن لڑنے والے فسادیوں سے سمجھے کہ

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اللہ اچھے[۱۴۱] ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور اُن لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں[۱۴۲] گے۔

میری محنت اور قربانی کے ثمرات یوں خاک میں مل کر رہے۔

۱۴۱ – اب تقریر اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے، اس لیے خاتمۂ کلام پر نصیحت اور ملامت کے مِلے جُلے انداز میں لوگوں کو ان کی چند نمایاں ترین گمراہیوں پر مُتنبّہ کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی پیغمبرؐ کی دعوت کے مقابلے میں انکار و اِستہزا کا جو رَوِیّہ انھوں نے اختیار کر رکھا تھا، اُس کی غَلطی سمجھاتے ہوئے اس کے بُرے انجام سے اُنھیں خبردار کیا جا رہا ہے۔

۱۴۲ – انسان اپنی زبان میں اشیا کے جو نام رکھتا ہے، وہ دراصل اس تصوُّر پر مبنی ہوتے ہیں جو اس کے ذہن میں اُن اشیا کے متعلق ہُوا کرتا ہے۔ تصور کا نَقص نام کے نَقص کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اور نام کا نَقص تصوّر کے نَقص پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اشیا کے ساتھ انسان کا تعلق اور معاملہ بھی لازماً اُس تصوّر پر ہی مبنی ہوا کرتا ہے جو وہ اپنے ذہن میں ان کے متعلق رکھتا ہے۔ تصور کی خرابی تعلق کی خرابی میں رونما ہوتی ہے، اور تصور کی صحّت و دُرستی تعلّق کی صحّت و دُرستی میں نمایاں ہو کر رہتی ہے۔ یہ حقیقت جس طرح دنیا کی تمام چیزوں کے معاملے میں صحیح ہے، اسی طرح اللہ کے معاملے میں بھی صحیح ہے۔ اللہ کے لیے نام (خواہ وہ اسمائے ذات ہوں یا اسمائے صفات) تجویز کرنے میں انسان جو غلطی بھی کرتا ہے وہ دراصل اللہ کی ذات و صفات کے متعلق اس کے عقیدے کی غلطی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پھر خدا کے متعلق اپنے تصور و اعتقاد میں انسان جتنی اور جیسی غلطی کرتا ہے، اتنی ہی اور ویسی ہی غلطی اس سے اپنی زندگی کے پورے اخلاقی رَوِیّے کی تشکیل میں بھی سرزد ہوتی ہے، کیونکہ انسان کے اخلاقی رَوِیّے کی تشکیل تمام تر منحصر ہے اُس تصوّر پر جو اس نے خدا کے بارے میں اور خدا کے ساتھ اپنے اور کائنات کے تعلق کے بارے میں قائم کیا ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ خدا کے نام رکھنے میں غلطی کرنے سے بچو، خدا کے لیے اچھے نام ہی موزوں ہیں اور اسے اُنھی ناموں سے یاد کرنا چاہیے، اس کے نام تجویز کرنے میں الحاد کا انجام بہت بُرا ہے۔

”اچھے ناموں“ سے مراد وہ نام ہیں جن سے خدا کی عظمت و برتری، اس کے تقدس اور پاکیزگی، اور اس کی صفاتِ کمالیہ کا اظہار ہوتا ہو۔ ”الحاد“ کے معنیٰ ہیں: وسط سے ہٹ جانا، سیدھے رُخ سے منحرف ہو جانا۔ تیر جب ٹھیک نشانے پر بیٹھنے کے بجائے کسی دوسری طرف جا لگتا ہے تو عربی میں کہتے ہیں: اَلحد السهمُ الهدفَ، یعنی تیر نے نشانے سے الحاد کیا۔ خدا کے نام رکھنے میں الحاد یہ ہے کہ خدا کو ایسے نام دیے جائیں جو اس کے مرتبے سے فروتر ہوں، جو اس کے ادب کے منافی ہوں، جن سے عیوب اور نقائص اس کی طرف منسوب ہوتے ہوں، یا جن سے اس کی ذاتِ اقدس و اعلیٰ کے متعلق کسی غلط عقیدے کا اظہار ہوتا ہو۔

ع ۲۲ / ۱۰ / ۱۲

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ ع وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ ج وَاُمْلِيْ لَهُمْ ط قف اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا سکتة مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ط اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ لا وَّاَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ

ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہدایت اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا ہے۔ع رہے وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے، تو انھیں ہم بتدریج ایسے طریقے سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انھیں خبر تک نہ ہوگی۔ میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں، میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے۔

اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ اِن کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار ہے جو (بُرا انجام سامنے آنے سے پہلے) صاف صاف متنبّہ کر رہا ہے۔ کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟[۱۴۳] اور کیا یہ بھی انھوں نے نہیں سوچا کہ شاید اِن کی مُہلتِ زندگی پوری ہونے کا وقت

نیز یہ بھی الحاد ہی ہے کہ مخلوقات میں سے کسی کے لیے ایسا نام رکھا جائے جو صرف خدا ہی کے لیے موزوں ہو۔ پھر یہ جو فرمایا کہ اللہ کے نام رکھنے میں جو لوگ الحاد کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ سیدھی طرح سمجھانے سے نہیں سمجھتے تو ان کی کج بحثیوں میں تم کو الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں، اپنی گمراہی کا انجام وہ خود دیکھ لیں گے۔

۱۴۳ — رفیق سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپؐ انھی لوگوں میں پیدا ہوئے، انھی کے درمیان رہے بسے، بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھے ہوئے۔ نبوت سے پہلے ساری قوم آپؐ کو ایک نہایت سلیم الطبع اور صحیح الدماغ آدمی کی حیثیت

اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ ؕ وَ یَذَرُهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ ۚ لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؔۘ ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ یَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِیٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

وقف منزل
وقف لازم

قریب آ لگا ہو؟[۱۴۴] پھر آخر پیغمبرؐ کی اِس تنبیہ کے بعد اور کون سی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟ ـــــ جس کو اللہ رہنمائی سے محروم کر دے اُس کے لیے پھر کوئی رہنما نہیں ہے، اور اللہ اِنھیں اِن کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہُوا چھوڑے دیتا ہے۔

یہ لوگ تم سے پُوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہو گی؟ کہو: ”اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے۔ اُسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔ آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت ہوگا۔ وہ تم پر اچانک آ جائے گا۔“ یہ لوگ اس کے متعلق تم سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہو۔ کہو: ”اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔“

سے جانتی تھی۔ نبوت کے بعد جب آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچانا شروع کیا تو یکایک آپؐ کو مجنون کہنے لگی۔ ظاہر ہے کہ یہ حکمِ جُنون اُن باتوں پر نہ تھا جو آپؐ نبی ہونے سے پہلے کرتے تھے، بلکہ صرف انھی باتوں پر لگایا جا رہا تھا جن کی آپؐ نے نبی ہونے کے بعد تبلیغ شروع کی۔ اِسی وجہ سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان لوگوں نے کبھی سوچا بھی ہے، آخر ان باتوں میں سے کون سی بات جنون کی ہے؟ کون سی بات بے تُکی، بے اصل اور غیر معقول ہے؟ اگر یہ آسمان و زمین کے نظام پر غور کرتے، یا خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کو بھی بنظرِ تأمّل دیکھتے تو انھیں خود معلوم ہو جاتا کہ شرک کی تردید، توحید کے اثبات، بندگیِ رب کی دعوت اور انسان کی ذمّہ داری و جواب دہی کے بارے میں جو کچھ اُن کا بھائی انھیں سمجھا رہا ہے، اس کی صداقت پر پورا نظامِ کائنات اور خلق اللہ کا ذرّہ ذرّہ شہادت دے رہا ہے۔

۱۴۴ـ یعنی نادان اتنا بھی نہیں سوچتے کہ موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے، کچھ خبر نہیں کہ کب کس کی اجل آن پوری

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا

معانقة ۸ — ع ۲۳ / ۱۴

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ "میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے۔ اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔[۱۴۵] میں تو محض ایک خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں اُن لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں۔"ع

وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سُکون حاصل کرے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لیے لیے وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں نے مل کر اللہ، اپنے رب سے دعا

ہو۔ پھر اگر ان میں سے کسی کا آخری وقت آ گیا اور اپنے رَوِیّے کی اصلاح کے لیے جو مُہلت اسے ملی ہوئی ہے وہ انھی گمراہیوں اور بداعمالیوں میں ضائع ہوگئی، تو آخر اس کا حشر کیا ہوگا؟

۱۴۵ — مطلب یہ ہے کہ قیامت کی ٹھیک تاریخ وہی بتا سکتا ہے جسے غیب کا علم ہو، اور میرا حال یہ ہے کہ میں کل کے متعلق بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ یا میرے بال بچوں کے ساتھ کیا کچھ پیش آنے والا ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اگر یہ علم مجھے حاصل ہوتا تو میں کتنے نقصانات سے قبل از وقت آگاہ ہو کر بچ جاتا، اور کتنے فائدے محض پیشگی علم کی بدولت اپنی ذات کے لیے سمیٹ لیتا۔ پھر یہ تمھاری کتنی بڑی نادانی ہے کہ تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ قیامت کب آئے گی۔

لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾

کی کہ اگر تُو نے ہم کو اچھا سا بچہ دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو ایک صحیح وسالم بچہ دے دیا تو وہ اس کی اس بخشش و عنایت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھیرانے لگے۔ اللہ بہت بلند و برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔[۱۴۶] کیسے نادان ہیں یہ لوگ کہ اُن کو خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں،

۱۴۶– یہاں مشرکین کی جاہلانہ گمراہیوں پر تنقید کی گئی ہے۔ تقریر کا مدّعا یہ ہے کہ نوعِ انسانی کو ابتداءً وجود بخشنے والا اللہ تعالیٰ ہے جس سے خود مشرکین کو بھی انکار نہیں۔ پھر ہر انسان کو وجود عطا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور اس بات کو بھی مشرکین جانتے ہیں۔ عورت کے رحم میں نطفے کو ٹھیرانا، پھر اس خفیف سے حمل کو پرورش کر کے ایک زندہ بچے کی صورت دینا، پھر اس بچے کے اندر طرح طرح کی قوتیں اور قابلیتیں ودیعت کرنا اور اس کو صحیح وسالم انسان بنا کر پیدا کرنا، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اگر اللہ عورت کے پیٹ میں بندر یا سانپ یا کوئی اور عجیب الخلقت حیوان پیدا کر دے، یا بچے کو پیٹ ہی میں اندھا بہرا لنگڑا لُولا بنا دے، یا اس کی جسمانی و ذہنی اور نفسانی قوتوں میں کوئی نقص رکھ دے، تو کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اللہ کی اس ساخت کو بدل ڈالے۔ اس حقیقت سے مشرکین بھی اسی طرح آگاہ ہیں جس طرح مُوَحِّدین۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ حمل میں ساری اُمیدیں اللہ ہی سے وابستہ ہوتی ہیں کہ وہی صحیح وسالم بچہ پیدا کرے گا۔ لیکن اس پر بھی جہالت و نادانی کے طُغیان کا یہ حال ہے کہ جب اُمید بر آتی ہے اور چاند سا بچہ نصیب ہو جاتا ہے تو شکریے کے لیے نذریں اور نیازیں کسی دیوی، کسی اوتار، کسی ولی اور کسی حضرت کے نام پر چڑھائی جاتی ہیں، اور بچے کو ایسے نام دیے جاتے ہیں کہ گویا وہ خدا کے سوا کسی اور کی عنایت کا نتیجہ ہے، مثلاً حسین بخش، پیر بخش، عبدالرسول، عبدالعُزّیٰ اور عبدِشمس وغیرہ۔

اس تقریر کے سمجھنے میں ایک بڑی غلط فہمی واقع ہوئی ہے جسے ضعیف رِوایات نے اور زیادہ تقویت پہنچا دی۔ چونکہ آغاز میں نوعِ انسانی کی پیدایش ایک جان سے ہونے کا ذکر آیا ہے، جس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، اور پھر فوراً ہی ایک مرد و عورت کا ذکر شروع ہو گیا ہے، جنھوں نے پہلے تو اللہ سے صحیح وسالم بچے کی پیدایش کے لیے دعا کی اور جب بچہ پیدا ہو گیا تو اللہ کی بخشش میں دوسروں کو شریک ٹھیرا لیا، اس لیے لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ شرک کرنے والے میاں بیوی ضرور حضرت آدم و حوا علیہما السلام ہی ہوں گے۔ اس غلط فہمی پر رِوایات کا ایک خول چڑھ گیا اور ایک پورا قصّہ تصنیف

وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٢﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ

جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ آپ اپنی مدد ہی پر قادر ہیں۔ اگر تم انھیں سیدھی راہ پر آنے کی دعوت دو تو وہ تمھارے پیچھے نہ آئیں، تم خواہ انھیں پکارو یا خاموش رہو، دونوں صورتوں میں

کر دیا گیا کہ حضرت حوّا کے بچے پیدا ہو ہو کر مر جاتے تھے، آخرِ کار ایک بچے کی پیدائش کے موقع پر شیطان نے ان کو بہکا کر اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اس کا نام عبدالحارث (بندۂ شیطان) رکھ دیں۔ غضب یہ ہے کہ ان روایات میں سے بعض کی سند نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی پہنچا دی گئی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تمام روایات غلط ہیں اور قرآن کی عبارت بھی ان کی تائید نہیں کرتی۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا پہلا جوڑا جس سے آفرینش کی ابتدا ہوئی، اس کا خالق بھی اللہ ہی تھا، کوئی دوسرا اِس کارِ تخلیق میں شریک نہ تھا، اور پھر ہر مرد و عورت کے ملاپ سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس کا خالق بھی اللہ ہی ہے، جس کا اقرار تم سب لوگوں کے دلوں میں موجود ہے، چنانچہ اسی اقرار کی بدولت تم اُمید و بیم کی حالت میں جب دعا مانگتے ہو تو اللہ ہی سے مانگتے ہو، لیکن بعد میں جب اُمیدیں پوری ہو جاتی ہیں تو تمھیں شرک کی سوجھتی ہے۔ اس تقریر میں کسی خاص مرد اور خاص عورت کا ذکر نہیں ہے بلکہ مشرکین میں سے ہر مرد اور ہر عورت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

اس مقام پر ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی مذمّت کی ہے، وہ عرب کے مشرکین تھے اور ان کا قصور یہ تھا کہ وہ صحیح و سالم اولاد پیدا ہونے کے لیے تو خدا ہی سے دعا مانگتے تھے، مگر جب بچہ پیدا ہو جاتا تھا تو اللہ کے اس عطیے میں دوسروں کو شکریے کا حصہ دار ٹھیرا لیتے تھے۔ بلا شبہ یہ حالت بھی نہایت بُری تھی، لیکن اب جو شرک ہم توحید کے مدّعیوں میں پا رہے ہیں، وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ یہ ظالم تو اولاد بھی غیروں ہی سے مانگتے ہیں، حمل کے زمانے میں منّتیں بھی غیروں کے نام ہی کی مانتے ہیں، اور بچہ پیدا ہونے کے بعد نیاز بھی انھی کے آستانوں پر چڑھاتے ہیں۔ اس پر بھی زمانۂ جاہلیّت کے عرب مشرک تھے اور یہ مؤحّد ہیں، اُن کے لیے جہنّم واجب تھی اور اِن کے لیے نجات کی گارنٹی ہے، اُن کی گمراہیوں پر تنقید کی زبانیں تیز ہیں مگر اِن کی گمراہیوں پر کوئی تنقید کر بیٹھے تو مذہبی درباروں میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اسی حالت کا ماتم حالی مرحوم نے اپنی مُسدّس میں کیا ہے:

کرے غیر گر بُت کی پوجا تو کافر — جو ٹھیرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر — کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں — پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں — اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ جا جا کے نذریں چڑھائیں — شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے — نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِهَاۤ١٘ اَمْ لَهُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِهَاۤ١٘ اَمْ لَهُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِهَاۤ١٘ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا١ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِیْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِیِّ‌ۧ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ١ۖ٘ وَ هُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹۶﴾

تمھارے لیے یکساں ہی رہے۔[147] تم لوگ خدا کو چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہو وہ تو محض بندے ہیں جیسے تم بندے ہو۔ ان سے دعائیں مانگ دیکھو، یہ تمھاری دعاؤں کا جواب دیں اگر ان کے بارے میں تمھارے خیالات صحیح ہیں۔ کیا یہ پاؤں رکھتے ہیں کہ ان سے چلیں؟ کیا یہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ ان سے پکڑیں؟ کیا یہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھیں؟ کیا یہ کان رکھتے ہیں کہ ان سے سنیں؟[148] اے محمدؐ! ان سے کہو کہ "بلا لو اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو، پھر تم سب مل کر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، میرا حامی و ناصر وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک آدمیوں کی حمایت کرتا ہے،[149]

۱۴۷ – یعنی ان مشرکین کے معبودانِ باطل کا حال یہ ہے کہ سیدھی راہ دکھانا اور اپنے پرستاروں کی رہنمائی کرنا تو درکنار، وہ بیچارے تو کسی رہنما کی پیروی کرنے کے قابل بھی نہیں، حتّٰی کہ کسی پکارنے والے کی پکار کا جواب تک نہیں دے سکتے۔

۱۴۸ – یہاں ایک بات صاف طور پر سمجھ لینی چاہیے۔ مشرکانہ مذاہب میں تین چیزیں الگ الگ پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ اصنام، تصاویر یا علامات جو مَرجِع پرستش (objects of worship) ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ اشخاص یا ارواح یا مَعانی جو دراصل معبود قرار دیے جاتے ہیں، اور جن کی نمایندگی اصنام اور تصاویر وغیرہ کی شکل میں کی جاتی ہے۔ تیسرے وہ اعتقادات جو اِن مشرکانہ عبادات و اعمال کی تہ میں کارفرما ہوتے ہیں۔ قرآن مختلف طریقوں سے ان تینوں چیزوں پر ضرب لگاتا ہے۔ اِس مَقام پر اُس کی تنقید کا رُخ پہلی چیز کی طرف ہے، یعنی وہ بُت محلِ اعتراض ہیں جن کے سامنے مشرکین اپنے مراسمِ عبادات ادا کرتے اور اپنی عرضیاں اور نیازیں پیش کرتے تھے۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ ج وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِى الْغَيِّ

بخلاف اِس کے تم جنھیں خدا کو چھوڑ کر پُکارتے ہو، وہ نہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد ہی کرنے کے قابل ہیں، بلکہ اگر تم انھیں سیدھی راہ پر آنے کے لیے کہو تو وہ تمھاری بات سُن بھی نہیں سکتے۔ بظاہر تم کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہیں مگر فی الواقع وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔“

اے نبیؐ! نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ اُلجھو۔ اگر کبھی شیطان تمھیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو، وہ سب کچھ سُننے اور جاننے والا ہے۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال اگر انھیں چھُو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنّے ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریقِ کار کیا ہے۔ رہے ان کے (یعنی شیاطین کے) بھائی بند، تو وہ انھیں ان کی کج روی میں کھینچے لیے چلے جاتے ہیں

---

۱۴۹ – یہ جواب ہے مشرکین کی اُن دھمکیوں کا جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تم ہمارے اِن معبُودوں کی مخالفت کرنے سے باز نہ آئے اور ان کی طرف سے لوگوں کے عقیدے اسی طرح خراب کرتے رہے تو تم پر

ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا

اور انھیں بھٹکانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔[۱۵۰]

اے نبیؐ! جب تم اِن لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (یعنی معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ

ان کا غضب ٹوٹ پڑے گا اور وہ تمھیں اُلٹ کر رکھ دیں گے۔

۱۵۰ – ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت وتبلیغ اور ہدایت و اصلاح کی حکمت کے چند اہم نِکات بتائے گئے ہیں، اور مقصود صرف حضورؐ ہی کو تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ حضورؐ کے ذریعے سے اُن سب لوگوں کو یہی حکمت سکھانا ہے جو حضورؐ کے قائم مَقام بن کر دنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے اُٹھیں۔ ان نِکات کو سلسلہ وار دیکھنا چاہیے:

(۱) داعیِ حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خُو، متحمل اور عالی ظرف ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق، عامّۃ النّاس کے لیے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے رفقا کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے، نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے، مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذا رسانی اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اُس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیے۔ سخت گیری، دُرُشت خوئی، تلخ گفتاری اور منتقمانہ اشتعالِ طبع اِس کام کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے بنتا نہیں ہے۔ اسی چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ "غضب اور رضا، دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں، جو مجھ سے کٹے میں اس سے جُڑوں، جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں، جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔" اور اسی چیز کی ہدایت آپؐ ان لوگوں کو کرتے تھے جنھیں آپؐ دین کے کام پر اپنی طرف سے بھیجتے تھے کہ بشروا ولا تنفروا ویسروا ولا تعسروا، یعنی "جہاں تم جاؤ وہاں تمھاری آمد لوگوں کے لیے مژدۂ جاں فزا ہو نہ کہ باعث نفرت، اور لوگوں کے لیے تم سہولت کے موجب بنو نہ کہ تنگی وسختی کے۔" اور اسی چیز کی تعریف اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی ہے کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ یعنی "یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم اِن لوگوں کے لیے نرم ہو، ورنہ اگر تم دُرُشت خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔" (آلِ عمران، ۱۵۹)

(۲) دعوتِ حق کی کامیابی کا گُر یہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کے بجائے لوگوں کو معروف یعنی اُن سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کرے جنھیں بالعُموم سارے ہی انسان بھلا جانتے ہیں، یا جن کی بھلائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقلِ عام (common sense) کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔ اس طرح داعیِ حق کا اپیل عوام وخواص سب کو متأثر کرتا ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ نکال لیتا ہے۔ ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شورش برپا

کرتے ہیں، وہ خود اپنی ناکامی اور اس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ عام انسان، خواہ وہ کتنے ہی تعصبات میں مبتلا ہوں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے، اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر رہے ہیں، تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود مخالفینِ حق سے پھرتے اور داعیِ حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ آخرِ کار میدانِ مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کے ذاتی مفاد نظامِ باطل کے قیام ہی سے وابستہ ہیں، یا پھر جن کے دلوں میں تقلیدِ اسلاف اور جاہلانہ تعصّبات نے کسی روشنی کے قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہ چھوڑی ہو۔ یہی وہ حکمت تھی جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں کامیابی حاصل ہوئی اور پھر آپؐ کے بعد تھوڑی ہی مدّت میں اسلام کا سیلاب قریب کے ملکوں پر اس طرح پھیل گیا کہ کہیں ۱۰۰ فی صد اور کہیں ۸۰ اور ۹۰ فی صد باشندے مسلمان ہو گئے۔

(۳) اس دعوت کے کام میں جہاں یہ بات ضروری ہے کہ طالبینِ خیر کو معروف کی تلقین کی جائے، وہاں یہ بات بھی اتنی ہی ضروری ہے کہ جاہلوں سے نہ اُلجھا جائے، خواہ وہ الجھنے اور اُلجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ داعی کو اس معاملے میں سخت محتاط ہونا چاہیے کہ اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے رہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔ اور جب کوئی شخص جہالت پر اُتر آئے اور حجت بازی، جھگڑالو پَن اور طعن و تشنیع شروع کر دے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس جھگڑے میں اُلجھنے کا حاصل کچھ نہیں ہے، اور نقصان یہ ہے کہ داعی کی جس قوت کو اشاعتِ دعوت اور اصلاحِ نفوس میں خرچ ہونا چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہو جاتی ہے۔

(۴) نمبر ۳ میں جو ہدایت کی گئی ہے، اسی کے سلسلے میں مزید ہدایت یہ ہے کہ جب کبھی داعیِ حق مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں اور ان کے جاہلانہ اعتراضات و الزامات پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ نزغِ شیطانی (یعنی شیطان کی اُکساہٹ) ہے اور اسی وقت خدا سے پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں بہ نکلنے سے بچائے اور ایسا بے قابو نہ ہونے دے کہ اُس سے دعوتِ حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے۔ دعوتِ حق کا کام بہرحال ٹھنڈے دل سے ہی ہو سکتا ہے، اور وہی قدم صحیح اُٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر، خوب سوچ سمجھ کر اُٹھایا جائے۔ لیکن شیطان، جو اس کام کو فروغ پاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا، ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے داعیِ حق پر طرح طرح کے حملے کرائے اور پھر ہر حملے پر داعیِ حق کو اُکسائے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے، اکثر بڑی بڑی پُرفریب تاویلوں اور مذہبی اصلاحوں کے غلاف میں لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تہ میں بجز نفسانیت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے آخری دو آیتوں میں فرمایا کہ جو لوگ متقی (یعنی خدا ترس اور بدی سے بچنے کے خواہش مند) ہیں، وہ تو اپنے نفس میں کسی شیطانی تحریک کا اثر اور کسی بُرے خیال کی کھٹک محسوس کرتے ہی فوراً چوکنّے ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس موقع پر دعوتِ حق کا مفاد کس طرزِ عمل کے اختیار کرنے میں ہے اور حق پرستی کا تقاضا کیا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے کام میں نفسانیت کی لاگ لگی ہوئی ہے اور اس وجہ سے جن کا شیاطین کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق ہے، تو وہ شیطانی تحریک کے مقابلے میں نہیں ٹھیر سکتے اور اس سے مغلوب ہو کر غلط راہ پر چل نکلتے ہیں۔ پھر جس وادی میں

لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَىَّ مِنْ رَّبِّىْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

تم نے اپنے لیے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کرلی؟[۱۵۱] اِن سے کہو: ”میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب نے میری طرف بھیجی ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں تمھارے رب کی طرف سے، اور ہدایت اور رحمت ہے اُن لوگوں کے لیے جو اِسے قبول کریں۔[۱۵۲]

شیطان چاہتا ہے انھیں لیے پھرتا ہے، اور کہیں جا کر ان کے قدم نہیں رُکتے۔ مخالف کی ہر گالی کے جواب میں ان کے پاس گالی اور ہر چال کے جواب میں اس سے بڑھ کر چال موجود ہوتی ہے۔

اس ارشاد کا ایک عُمومی محل بھی ہے اور وہ یہ کہ اہلِ تقویٰ کا طریقہ بالعموم اپنی زندگی میں غیر متقی لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ جو لوگ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ بُرائی سے بچیں، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ بُرے خیال کا ایک ذرا سا غبار بھی اگر ان کے دل کو چھو جاتا ہے تو انھیں ویسی ہی کھٹک محسوس ہونے لگتی ہے جیسی کھٹک اُنگلی میں پھانس چبھ جانے یا آنکھ میں کسی ذرّے کے گر جانے سے محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بُرے خیالات، بُری خواہشات اور بُری نیتوں کے خُوگر نہیں ہوتے، اس وجہ سے یہ چیزیں ان کے لیے اُسی طرح خلافِ مزاج ہوتی ہیں جس طرح اُنگلی کے لیے پھانس، یا آنکھ کے لیے ذرّہ، یا ایک نفیس طبع اور صفائی پسند آدمی کے لیے کپڑوں پر سیاہی کا ایک داغ یا گندگی کی ایک چھینٹ۔ پھر جب یہ کھٹک انھیں محسوس ہو جاتی ہے تو اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اُن کا ضمیر بیدار ہو کر اس غبارِ شر کو اپنے اُوپر سے جھاڑ دینے میں لگ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ نہ خدا سے ڈرتے ہیں، نہ بدی سے بچنا چاہتے ہیں، اور جن کی شیطان سے لاگ لگی ہوئی ہے، ان کے نفس میں بُرے خیالات، بُرے ارادے، بُرے مقاصد پکتے رہتے ہیں اور وہ ان گندی چیزوں سے کوئی اُپراہٹ اپنے اندر محسوس نہیں کرتے، بالکل اسی طرح جیسے کسی دیگچی میں سؤر کا گوشت پک رہا ہو اور وہ بے خبر ہو کہ اس کے اندر کیا پک رہا ہے، یا جیسے کسی بھنگی کا جسم اور اس کے کپڑے غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہوں اور اسے کچھ احساس نہ ہو کہ وہ کن چیزوں میں آلودہ ہے۔

۱۵۱ – کفار کے اس سوال میں ایک صریح طعن کا انداز پایا جاتا تھا۔ یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میاں جس طرح تم نبی بن بیٹھے ہو، اسی طرح کوئی معجزہ بھی چھانٹ کر اپنے لیے بنا لائے ہوتے۔ لیکن آگے مُلاحظہ ہو کہ اس طعن کا جواب کس شان سے دیا جاتا ہے۔

۱۵۲ – یعنی میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو یا جس کی مَیں خود ضرورت محسوس کروں، اسے خود ایجاد یا تصنیف کر کے پیش کر دوں۔ میں تو ایک رسول ہوں اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں۔ معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے، وہ یہ قرآن ہے۔ اس کے اندر بصیرت افروز روشنیاں

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

جب قرآن تمھارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو، شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔"[۱۵۳]

اے نبیؐ! اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔[۱۵۴]

موجود ہیں اور اس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو مان لیتے ہیں ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے اور ان کے اخلاقِ حسنہ میں رحمتِ الٰہی کے آثار صاف ہُوَیدا ہونے لگتے ہیں۔

۱۵۳ — یعنی یہ جو تعصّب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے تم لوگ قرآن کی آواز سنتے ہی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو اور شور و غل برپا کرتے ہو تاکہ نہ خود سنو اور نہ کوئی دوسرا سُن سکے، اس رَوِش کو چھوڑ دو اور غور سے سنو تو سہی کہ اس میں تعلیم کیا دی گئی ہے۔ کیا عجب کہ اس کی تعلیم سے واقف ہو جانے کے بعد تم خود بھی اُسی رحمت کے حصّہ دار بن جاؤ جو ایمان لانے والوں کو نصیب ہو چکی ہے۔ مخالفین کی طعن آمیز بات کے جواب میں یہ ایسا لطیف و شیریں اور ایسا دلوں کو مسخّر کرنے والا اندازِ تبلیغ ہے کہ اس کی خوبی کسی طرح بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ جو شخص حکمتِ تبلیغ سیکھنا چاہتا ہو، وہ اگر غور کرے تو اس جواب میں بڑے سبق پا سکتا ہے۔

اس آیت کا اصل مقصود تو وہی ہے جو ہم نے اُوپر بیان کیا ہے، لیکن ضمناً اس سے یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ جب خدا کا کلام پڑھا جا رہا ہو تو لوگوں کو ادب سے خاموش ہو جانا چاہیے اور توجہ کے ساتھ اسے سننا چاہیے۔ اسی سے یہ بات بھی مُستَنبَط ہوتی ہے کہ امام جب نماز میں قرآن کی تلاوت کر رہا ہو تو مقتدیوں کو خاموشی کے ساتھ اس کی سماعت کرنی چاہیے۔ لیکن اس مسئلے میں ائمّہ کے درمیان اختلاف واقع ہو گیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ امام کی قراءت خواہ جَہری ہو یا سِرّی، مقتدیوں کو خاموش ہی رہنا چاہیے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ صرف جَہری قراءت کی صورت میں مقتدیوں کو خاموش رہنا چاہیے۔ لیکن امام شافعیؒ اس طرف گئے ہیں کہ جَہری اور سِرّی دونوں صورتوں میں مقتدی کو قراءت کرنی چاہیے، کیونکہ بعض احادیث کی بنا پر وہ سمجھے ہیں کہ جو شخص نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

إِنَّ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ ۩ ﴿٢٠٦﴾

جو فرشتے تمھارے رب کے حُضور تقرُّب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آ کر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے[155]، اور اس کی تسبیح کرتے ہیں[156]، اور اس کے آگے جُھکے رہتے ہیں[157]۔ ع

۱۵۴ – یاد کرنے سے مراد نماز بھی ہے اور دوسری قسم کی یاد بھی، خواہ وہ زبان سے ہو یا خیال سے۔ صبح و شام سے مراد یہی دونوں وقت بھی ہیں اور ان اوقات میں اللہ کی یاد سے مقصود نماز ہے، اور صبح و شام کا لفظ ''دائماً'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس سے مقصود ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہنا ہے۔ یہ آخری نصیحت ہے جو خطبے کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمائی گئی ہے اور اس کی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ تمھارا حال کہیں غافلوں کا سا نہ ہو جائے۔ دنیا میں جو کچھ گمراہی پھیلی ہے اور انسان کے اخلاق و اعمال میں جو فساد بھی رُونما ہوا ہے، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ خدا اُس کا رب ہے اور وہ خدا کا بندہ ہے اور دنیا میں اُس کو آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے اور دنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد اسے اپنے رب کو حساب دینا ہوگا۔ پس جو شخص راہِ راست پر چلنا اور دنیا کو اُس پر چلانا چاہتا ہو، اُس کو سخت اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ بھول کہیں خود اُس کو لاحق نہ ہو جائے۔ اسی لیے نماز اور ذکرِ الٰہی اور دائمی توجہ الی اللہ کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔

۱۵۵ – مطلب یہ ہے کہ بڑائی کا گھمنڈ اور بندگی سے منہ موڑنا شیاطین کا کام ہے اور اس کا نتیجہ پستی و تنزّل ہے۔ بخلاف اس کے، خدا کے آگے جھکنا اور بندگی میں ثابت قدم رہنا ملکوتی فعل ہے اور اس کا نتیجہ ترقی و بلندی اور خدا سے تقرُّب ہے۔ اگر تم اس ترقی کے خواہش مند ہو تو اپنے طرزِ عمل کو شیاطین کے بجائے ملائکہ کے طرزِ عمل کے مطابق بناؤ۔

۱۵۶ – تسبیح کرتے ہیں، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا بے عیب اور بے نَقص اور بے خطا ہونا، ہر قسم کی کمزوریوں سے اس کا مُنَزَّہ ہونا، اور اس کا لاشریک اور بے مثل اور بے ہمتا ہونا دل سے مانتے ہیں، اِس کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں اور دائماً اس کے اظہار و اعلان میں مشغول رہتے ہیں۔

۱۵۷ – اس مقام پر حکم ہے کہ جو شخص اس آیت کو پڑھے یا سُنے وہ سجدہ کرے، تا کہ اس کا حال ملائکۂ مقربین کے حال سے مطابق ہو جائے، اور ساری کائنات کا انتظام چلانے والے کارکن جس خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں، اسی کے آگے وہ بھی ان سب کے ساتھ جھک جائے اور اپنے عمل سے فوراً یہ ثابت کر دے کہ وہ نہ تو کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے اور نہ خدا کی بندگی سے منہ موڑنے والا ہے۔

قرآنِ مجید میں ایسے ۱۴ مقامات ہیں جہاں آیاتِ سجدہ آئی ہیں۔ ان آیات پر سجدے کا مشروع ہونا تو مُتَّفَق عَلَیہ ہے،

مگر اس کے وُجوب میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سجدۂ تلاوت کو واجب کہتے ہیں، اور دوسرے علما نے اس کو سنت قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ایک بڑے مجمع میں قرآن پڑھتے اور اس میں جب آیتِ سجدہ آتی تو آپؐ خود بھی سجدے میں گر جاتے تھے اور جو شخص جہاں ہوتا وہیں سجدہ ریز ہو جاتا تھا، حتیٰ کہ کسی کو سجدہ کرنے کے لیے جگہ نہ ملتی تو وہ اپنے آگے والے شخص کی پیٹھ پر سر رکھ دیتا۔ یہ بھی رِوایات میں آیا ہے کہ آپؐ نے فتحِ مکہ کے موقع پر قرآن پڑھا اور اس میں جب آیتِ سجدہ آئی تو جو لوگ زمین پر کھڑے تھے انھوں نے زمین پر سجدہ کیا، اور جو گھوڑوں اور اُونٹوں پر سوار تھے وہ اپنی سواریوں پر ہی جھک گئے۔ کبھی آپؐ نے دورانِ خطبہ میں آیت سجدہ پڑھی ہے تو منبر سے اُتر کر سجدہ کیا ہے اور پھر اُوپر جا کر خطبہ شروع کر دیا ہے۔

اس سجدے کے لیے جُمہور اُنھی شرائط کے قائل ہیں جو نماز کی شرطیں ہیں، یعنی باوضو ہونا، قبلہ رُخ ہونا، اور نماز کی طرح سجدے میں زمین پر سر رکھنا۔ لیکن جتنی احادیث سجودِ تلاوت کے باب میں ہم کو ملی ہیں، ان میں کہیں اِن شرطوں کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اُن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آیتِ سجدہ سُن کر جو شخص جہاں، جس حال میں ہو، جُھک جائے، خواہ باوضو ہو یا نہ ہو، خواہ استقبالِ قبلہ ممکن ہو یا نہ ہو، خواہ زمین پر سر رکھنے کا موقع ہو یا نہ ہو۔ سَلَف میں بھی ہم کو ایسی شخصیّتیں ملتی ہیں جن کا عمل اِس طریقے پر تھا۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ وضو کے بغیر سجدۂ تلاوت کرتے تھے۔ اور ابوعبدالرحمٰن سُلَمی کے متعلق فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ راستہ چلتے ہوئے قرآنِ مجید پڑھتے جاتے تھے، اور اگر کہیں آیتِ سجدہ آ جاتی تو بس سر جھکا لیتے تھے، خواہ باوضو ہوں یا نہ ہوں، اور خواہ قبلہ رُخ بھی ہوں یا نہ ہوں۔ ان وجوہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ اگرچہ زیادہ مبنی بر احتیاط مسلک جُمہور ہی کا ہے، لیکن اگر کوئی شخص جُمہور کے مسلک کے خلاف عمل کرے تو اسے ملامت بھی نہیں کی جا سکتی، کیونکہ جُمہور کی تائید میں کوئی سنتِ ثابتہ موجود نہیں ہے، اور سَلَف میں ایسے لوگ پائے گئے ہیں جن کا عمل جُمہور کے مسلک سے مختلف تھا۔